اردو دنیا

بھیشم ساہنی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

چلو چاند پر چلیں

مصنف: جے پرکاش بھارتی

اس کتاب میں بے حد دلچسپ انداز میں چار کرداروں کی مدد سے چاند سے متعلق جدید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ بچوں کے لیے یہ کتاب بے حد معلوماتی ہے اور کھیل کھیل میں انھیں بہت سی جانکاریاں فراہم کرتی ہے۔

تیسرا ایڈیشن، صفحات: 64، قیمت: -/14 روپے

ہندستان کی بزرگ ہستیاں

مصنف: صفدر حسین

اس کتاب میں ہندستان کی چند عظیم شخصیات گوتم بدھ، شنکراچاریہ، خواجہ معین الدین چشتی، گرونانک، فریدالدین گنج شکر، میرابائی، تلسی داس، سوامی دیانند سرسوتی اور رام کرشن پرم ہنس کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کو ان بزرگ ہستیوں کے حالاتِ زندگی سے نہ صرف بھرپور واقفیت حاصل ہوگی بلکہ ان میں خود کو بہتر بنانے اور قوم اور ملک کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

پہلا ایڈیشن، صفحات: 87، قیمت: -/13 روپے

فسانۂ عجائب

مصنف: ڈاکٹر نورالحسن نقوی

یہ رجب علی بیگ سرور کی مشہور کتاب ہے جو پرتکلف عبارت اور مشکل اسلوب کے لیے مشہور ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے بچوں کے لیے اسے آسان زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ اس میں قصے سے قصہ نکلتا ہے اور کسا ہوا پلاٹ بھی موجود ہے۔

تیسرا ایڈیشن، صفحات: 83، قیمت: -/16 روپے

انوار سہیلی کی کہانیاں

مصنف: ملا حسین واعظ کاشفی

ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور کتاب سے ماخوذ منتخب کہانیاں جو دلچسپ بھی ہیں اور اخلاقیات کا درس بھی دیتی ہیں۔ جانوروں کی زبانی انسانی زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی۔ بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے۔ کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 93، قیمت: -/23 روپے

تنقید عقلِ محض

مصنف: ایمانوئل کانٹ، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین

جرمن فلسفی کانٹ اور اس کی اس مشہور و معروف کتاب کو جدید فلسفے میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کا موضوع بحث فلسفے کا سب سے دقیق مسئلہ یعنی نظریۂ علم ہے۔ اس ترجمے میں جو اصل کتاب سے براہِ راست کیا گیا ہے، نفسِ مضمون کو صحت، سلاست اور وضاحت کے ساتھ ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 488، قیمت: -/158 روپے

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت

مصنف: ابوالکلام قاسمی

اردو شعریات کے خد و خال کے تعین کے لیے اپنی لسانی اور ادبی جڑوں کی کھوج اور ان کی بازیافت ضروری ہے۔ اس کتاب میں عربی اور فارسی شعریات کے ان عناصر کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ جن کو اردو شعریات کی تشکیل میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

صفحات: 382، قیمت: -/124 روپے

اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا

مصنف: محمد اطہر علی، مترجم: امین الدین

اورنگ زیب کا عہدِ حکومت (1707-1658) مغل سلطنت کا دورِ عروج بھی ہے اور اس عظیم سلطنت کے زوال کا نقطۂ آغاز بھی۔ عروج و زوال کی اس کہانی میں اس کے دربار کے مغل امرا نے دانستہ یا نادانستہ کیا کردار ادا کیا، یہ کتاب اس سوال کا تفصیلی جواب پیش کرتی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 350، قیمت: -/126 روپے

دکنی ہندو اور اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

اردو جس گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے، اس کی تشکیل میں برصغیر ہند کی سبھی مذہبی اکائیاں شامل رہی ہیں۔ دکن میں جن ہندو شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں نے اردو کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ان کا اور ان کے کام کا تعارف۔

دوسرا ایڈیشن، صفحات: 298، قیمت: -/111 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔ 1، وِنگ۔ 6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ماہنامہ
اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔5، شمارہ۔9 ستمبر 2003

مدیر : ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر : ارجمند آرا

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 066 110
فون : 26103381, 26103938
فیکس :26108159، 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
فون:26109746
شاخ : 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدر آباد 500001(A.P.)
فون:24615139

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● دیہی بچوں کی تعلیم (گیسٹ کالم) .... وی. ایس. مہاجن 6
● اردو کی ترقی کے نئے امکانات .... فیروز بخت احمد 7
● تعلیم میں اقدار کا بحران .... دلیپ کے ڈورا/اشوک نندا 9
● زبانوں کے بڑھتے ہوئے قبرستان .... جگ ثریا اور وکاس سنگھ 13
● مشاعروں کی سماجی معنویت .... ابو الکلام 15
● خبر نگاری .... محمد شاہد حسین 20
● مقابلہ جاتی امتحانوں میں اردو طلبہ کی عدم شرکت کا مسئلہ .... سعید الظفر فاروقی 24
● اسپیس شٹل .... ایم. ایچ. قریشی 27
● گاؤں کی موت .... بھرت جھنجھن والا 29

گوشۂ ادب و ثقافت:
● رفیقِ سفر بھیشم ساہنی کی یاد میں .... قمر رئیس 31
● تاثرات .... فیروز عالم 33
● وانگ چو .... بھیشم ساہنی 35
● شمس الرحمٰن فاروقی سے ایک ملاقات (انٹرویو) .... جمیل اختر 45

گوشۂ فروغِ کتب
● مزے مزے کی باتیں... (فسانۂ آزاد سے اقتباس) .... رتن ناتھ سرشار 48
● جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی (اقتباس) .... مشیر الحسن 49

طلبہ کے لیے
● ذرائع ابلاغ (پرنٹ میڈیا) میں کیریئر کے مواقع (کیریئر گائیڈنس) وی. ایس. گپتا 53
● انٹرنیٹ گائیڈ .... نعیم احسن 56
● کوئز (سیاسیات) .... صلاح الدین 57
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-2) .... محمد سہیم الدین 60
قومی اردو کونسل کی موبائل وین آپ کے شہر آپ کے گاؤں میں. .... ادارہ 61
اُردو خبر نامہ .... ادارہ 62
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 72
● مثنوی بہرام و گل اندام / طبعی گولکنڈوی .... مبصر: مخمور سعیدی
● قواعد کیٹلاگ سازی / ضیاء الدین انصاری .... مبصر: محمد سہیم الدین ندوی
● دلچسپ کہانیاں / رام آسرا راز .... مبصر: شبنم آرا
● اٹل بہاری واجپئی۔ شخصیت اور خدمات / آباد جعفری .... مبصر: ملک راشد فیصل
● موتی اُگے دھان کے کھیت / بیکل اُتساہی .... مبصر: ایس. اے. رحمٰن
● تعاقب / خورشید جبیں چاندنی ● پیش رفت / پریمی رومانی

بچوں کا گوشہ
● سروپلی رادھا کرشنن ("ہمارے رہنما"، جلد-3 سے اقتباس) .... جے رادھا کرشنن 77

آپ کی بات

■ **حبیب الرحمٰن چغتائی، حریم، اپوزٹ جنتاری ہاؤس، دودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ**

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ "اردو دنیا" تواتر سے موصول ہو رہا ہے اور میں اردو دنیا کی سرگرمیوں سے باخبر رہتا ہوں۔ اردو کے فروغ کے لیے جو خدمات آپ انجام دے رہے ہیں، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ملکی سطح پر کمپیوٹر کی تعلیم کے مراکز قائم کرکے آپ نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے اور اردو داں طبقے کے لیے روزگار کی صورتیں پیدا کردی ہیں۔ میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

"اردو دنیا" کا معیار دن بدن بہتر ہو رہا ہے۔ اس میں کافی تنوع ہے اور ہر قسم کے قاری کے لیے مواد موجود ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ خوب ترقی کرے۔

■ **راشد جمال فاروقی، اے-1498، آئی. ڈی. پی. ایل. ٹاؤن شپ، ویر بھدرا (رشی کیش)، دہرادون-249202 اترانچل**

"اردو دنیا" پابندی سے موصول ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ مجھے دنیا جہان سے جوڑے رکھتا ہے، خصوصاً اردو دنیا سے۔ آپ کو تو یہ جان کر مسرت ہوگی ہی، "اردو دنیا" کے دیگر قارئین بھی میری بات پر توجہ دیں۔ ہوا یوں کہ یوپی کے گورنمنٹ انٹر کالجوں میں اردو کی TGT اسامیوں کے لیے جو تحریری امتحان ہونا تھا، اس کے سلسلے میں کچھ نوجوان مجھ سے ملے۔ میں نے انھیں "اردو دنیا" کے وہ شمارے مستعار دے دیے جن میں اردو ادب سے متعلق کوئز شامل تھے۔ آپ یقین کریں کہ تمام امیدوار امتحان دینے کے بعد میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ تمام سوالات ان کوئز کالموں والے ہی تھے۔ "اردو دنیا" کا کیا خوب مصرف ہے یہ!

■ **عزیز احمد، 8۔ آواس وکاس کالونی، بلند شہر روڈ، ہاپوڑ**

آج کے حالات میں اردو کو زندہ رکھنے کی ذمے داری بنیادی طور پر اردو اسپیکنگ کمیونٹی پر عائد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چند تجویزیں ہیں، جو میں آپ کے مؤقر جریدے کے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں:

- اپنے گھروں میں اردو کا ماحول بنائیں۔
- اپنے بچوں کو بہر صورت اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ اگر خود نہ جانتے ہوں تو پہلی فرصت میں اردو لکھنا پڑھنا سیکھیں۔
- اگر اسکول میں اردو پڑھانے کی سہولت نہ ہو تو اپنے بچوں کو گھر پر اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔
- ہر گھر میں ایک اردو اخبار خرید کر پڑھا جائے۔
- ہر گھر میں اردو کتابیں، خصوصاً بچوں کے مطالعے کے لیے اردو کتابیں اور رسالے خریدے جائیں۔
- گھر کا ہر کمانے والا اپنی ماہانہ آمدنی کا کم از کم ایک فیصد اردو زبان اور کلچر کے تحفظ پر لازماً صرف کرے۔
- ہر اردو جاننے والے کو آمادہ کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک اردو ناخواندہ شخص کو اردو لکھنا پڑھنا سکھائے۔
- اردو میڈیم سے ہائی اسکول، انٹر میڈیٹ، بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے امتحانات فاصلاتی طریقے سے پاس کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور نیشنل اوپن اسکول اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی فراہم کردہ سہولیات سے استفادے کی راہیں نکالیں۔ کمیونٹی کے نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری کریں اور ان میں اردو اخبارات و رسائل اور کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔
- اردو زبان سکھانے کے لیے اسپیشل کلاسیں لگائیں۔
- اردو نشستوں کا اہتمام کریں اور ان میں ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی بلائیں۔
- محلوں میں اردو ریڈنگ روم قائم کریں جن میں دوسری زبانوں کے اخبارات و رسائل بھی رکھے جائیں تاکہ دوسری زبانوں کے لوگ بھی وہاں آئیں اور اردو ماحول سے آشنا ہوں۔
- مقامی تعلیمی اداروں میں جہاں اردو کے شعبے نہیں ہیں، وہاں یہ شعبے قائم کرانے کی کوشش کریں۔
- اقلیتی تعلیمی اداروں یعنی مدرسوں میں باہمی تال میل قائم کرنے کی کوشش کریں۔
- مدرسوں میں اردو زبان کی تدریس جدید لسانیاتی خطوط پر کی جائے اور اردو ٹیچروں کی تربیت کے لیے Orientation Courses کا انتظام کیا جائے۔
- ان تعلیمی اداروں کے مابین تقریر و تحریر کے مقابلے منعقد کیے جائیں۔
- اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کام کرنے والے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے رابطہ رکھیں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔

■ **رفیق اشفاق، شعبۂ اردو، ڈی. سی. ایس. کے. پوسٹ گریجویٹ کالج، مئو ناتھ بھنجن-275101 (یو-پی)**

"اردو دنیا" جولائی 2003 کے شمارے میں مدارس کے تعلق سے آپ

کالواریہ، محمد اسلم قاسمی اور مشیر الحسن کے مضامین بہت ہی اہم، معلوماتی اور گراں قدر ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں تعلیمی میدان میں ہمارے ملک نے جس تیزی سے ترقی کی ہے اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ کمپیوٹر کے اس عہد میں ہمارے کچھ عربی مدارس نے بھی اپنے نصاب تعلیم میں اس کو شامل کیا ہے۔ مدارس کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کے ضمن میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ذمے دارانِ مدارس طلبہ میں صنعت و حرفت کی تعلیم کی جانب بھی رجحان پیدا کریں، اس کے ساتھ غیر سرکاری اسکول اور کالج چلانے والوں کی بھی یہ ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اپنے نصاب تعلیم میں اسلامک اسٹڈیز کا ایک پیریڈ شامل کر کے فراغدلی کا ثبوت دیں۔ "اردو دنیا" کا حالیہ شمارہ صوری و معنوی اعتبار سے بہت ہی خوب ہے۔ اس میں شامل تمام تخلیقات مدیر محترم کی ماہرانہ صلاحیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ گوشۂ ادب و ثقافت میں امیر قزلباش پر مخمور سعیدی کا مضمون بہت پسند آیا۔ اردو خبر نامہ، تبصرہ و تعارف اور کوئز کالم وغیرہ معلوماتی ہیں۔ اردو کے تعلق سے رام پرکاش کپور کا مراسلہ اردو والوں کے لیے لمحۂ فکریہ اور مشعل راہ ہے۔

■ **خالد کفایت، عصمت منزل، اسلام آباد، مالیر کوٹلہ**

اردو کی ترویج و ترقی کی سمت میں "اردو دنیا" اور "اردو رپورٹ" آپ کی مخلصانہ جد و جہد کا آئینہ ہیں۔ آپ نے پنجاب میں اردو اکادمی کے قیام کے لیے جو مثبت کوششیں کی ہیں، ہم اہل پنجاب اس کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہیں مگر جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، پنجاب میں اردو کا شہر مالیر کوٹلہ ہی ہے اور اکادمی کا صدر دفتر مالیر کوٹلہ میں ہی ہونا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔ مالیر کوٹلہ پنجاب کا واحد شہر ہے جہاں اردو ذریعہ تعلیم / پہلی زبان / دوسری زبان / اختیاری زبان کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ لہٰذا اسے مسلم اکثریتی شہر کے تعلق سے نہیں بلکہ اردو اکثریتی شہر کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

■ **علیم صبا نویدی، 26، امیر النسا بیگم اسٹریٹ، چنئی**

جولائی 2003 کے شمارے میں مخمور بھائی کا مضمون "امیر قزلباش" سے متعلق پڑھ کر مرحوم کے تعلق سے بہت ساری دیرینہ ملاقاتیں ذہن و دل میں تازہ ہو گئیں۔ ایسے زندہ دل لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

اس بار شکیل الرحمان صاحب نے بھی معلوماتی مضمون پیش کیا ہے۔ لیکن کشمیر میں اردو صحافت پر موصوف نے ہلکی سی روشنی ڈالی ہے یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہر کیف ہر علاقے کی اردو صحافت پر اس طرح کے مضامین شائع ہونا چاہیے اور یہ کام یقیناً "اردو دنیا" ہی کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ **رضوان خاں، سکریٹری بزم اردو سیتاپور، شیخ سرائے، سیتاپور**

"اردو دنیا" کا شمارہ بابت مئی 2003 موصول ہوا۔ اداریہ نہایت وقیع اور پُر مغز ہونے کے ساتھ غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ اردو کے ہمہ جہتی فروغ اور ترویج کے لیے جتنی زیادہ اہمیت اسکیمیں وضع کرنے کی ہے، اُس سے کہیں زیادہ ضرورت اردو کے رضاکار اداروں کی نیٹ ورکنگ کی ہے کیونکہ یہ ادارے ہی ان اسکیموں کو حقداروں تک پہنچانے کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ رؤف خیر صاحب کا مضمون "یگور — ناقدری سے قدر دانی تک" اچھا لگا۔ مضمون میں ایک جگہ یہ ذکر آیا ہے کہ وشوا بھارتی میں اردو، عربی اور فارسی کا گزر نہ تھا۔ یہاں یہ وضاحت درکار ہے کہ اس کی وجہ کیا تھی؟ جناب معصوم مرادآبادی کا مضمون "اردو صحافت کی جدید کاری" بھی عمدہ ہے۔ "اردو دنیا" سیتاپور میں تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔ اردو دوست حضرات اس میگزین کے مضامین پر آپس میں گفتگو اور تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ اس طرح یہاں کے ادبی ماحول میں مزید رونق آ رہی ہے۔

■ **محمد شاہنواز رضوی، نیو موڈرن ایجوکیشنل سوسائٹی، سٹی مارکیٹ، عالم گنج، بہار شریف (نالندہ)، بہار**

"اردو دنیا" اور "فکر و تحقیق" تقریباً چار سال سے میرے مطالعے میں ہیں۔ "اردو دنیا" تو معلومات کا خزانہ ہے۔ قومی اور بین الاقوامی اردو آبادی کی خبریں گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔ میں اردو کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں اور میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے کچھ کروں اور وقتاً فوقتاً اپنی حیثیت اور حوصلے کے مطابق اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے کوششیں کرتا رہتا ہوں۔ وہ طلبہ و طالبات جن کی مادری زبان اردو ہے، انھیں ترغیب دینی چاہیے کہ وہ اردو ذریعہ تعلیم کو اپنائیں اور مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی حاصل کر کے اپنا اور ملک کا نام روشن کریں۔ میں جانتا ہوں، آپ اس سلسلے میں کافی کام کر چکے ہیں، کر رہے ہیں اور آگے کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

■ **سیمیں فاطمہ، حکیم چک، رفیع گنج، اورنگ آباد، بہار**

"اردو دنیا" بروقت مل رہا ہے۔ جولائی 2003 کے شمارے میں "دو باتیں مدارس کے ذمے داروں سے" کے زیر عنوان محمد اسلم قاسمی صاحب کی کہی ہوئی باتیں پسند آئیں، میرا خیال بھی یہی ہے۔ موجودہ دور منطق و فلسفہ کا نہیں ہے۔ اس کی جگہ سائنس اور ٹکنالوجی نے لے لی ہے۔ ان عصری علوم کو مدارس کے نصاب میں شامل کر لینا چاہیے۔ شبنم آرا نے "انٹرنیٹ کتاب کا نعم البدل کس حد تک؟" میں انٹرنیٹ اور کتاب کا موازنہ کرتے ہوئے کتاب کی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ رضی احمد کا مضمون "ایوریسٹ فتح کے پچاس سال" بھی بے حد عمدہ ہے۔

■ محمد حبیب اللہ ندوی، 2/294، پھول باغ، لکھنؤ

"اردو دنیا" برابر پڑھ رہا ہوں۔ یہ ہندستان کے ان معدودے چند اردو رسائل میں سے ایک ہے، جنھیں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ اس بات کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ نے قومی اردو کونسل کے ذریعے اردو کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کردیا۔

■ محمد شمیم، کوہل ٹولی چوک، ہزاری باغ

"اردو دنیا" اشاعت کے پہلے سال سے ہی میرے زیر مطالعہ ہے۔ رسالہ پہلے شمارے سے ہی بہت مکمل نظر آیا۔ اردو میں اس مزاج کا کوئی دوسرا رسالہ نہیں ہے۔ اتنی کم قیمت میں اتنی معلومات کا ایک ساتھ ہونا، اپنے آپ میں ایک بڑی کامیابی ہے۔ کمپیوٹر، کوئز، اردو کے کلاسیکی ادب سے انتخاب، اردو دنیا کی خبریں — یہ سب مل کر واقعی "اردو دنیا" کو قوس و قزح بنا دیتے ہیں، اس میں کوئی کمی ہے تو وہ ہے شعر و ادب کی۔

■ طارق شمسی، 127، کٹرہ شہاب خاں، اٹاوہ

آپ کی ادارت میں "اردو دنیا" نے اردو داں حلقے میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔ ظاہری و باطنی خوبصورتی سے آراستہ یہ علمی اور ادبی گلدستہ آپ بڑی محنت سے سنوار رہے ہیں۔ مبارک باد قبول فرمایئے۔ اردو حلقوں کی خبروں کی شمولیت سے اردو دنیا کے حال چال سے بھی خوب واقفیت ہو رہی ہے۔ علم و ادب، طلبہ و نوجوان، سماج اور سیاست، ٹیکنالوجی اور احوال و کوائف ہر گوشے پر آپ کی کوشش اور محنت لائق مبارکباد ہے۔

■ قمی افروز، 98، ککھی ٹولہ، قلعہ بریلی شریف، بریلی (یوپی)

ماہنامہ "اردو دنیا" ہم گھر کے سبھی لوگ بہت دل لگا کر پڑھتے ہیں۔ میرے والد، والدہ، پھوپی اور میرے ماموں، سبھی کو "اردو دنیا" پسند ہے۔ ہم لوگ دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہم سب کو اردو پڑھنے کا شوق دے اور "اردو دنیا" کو خوب پھیلائے۔

■ محمد جلیل، گورنمنٹ اردو پرائمری اسکول، گلسار ام بہادگیر، گلبرگہ، کرناٹک

میں ماہنامہ "اردو دنیا" کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ اس سے مجھے اردو کی خبریں اور اردو کی ترویج و ترقی سے متعلق سرگرمیوں کی جانکاری ہوتی ہے۔ واقعی آپ کی نگرانی میں رسالہ ترقی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ رسالے کی کمپوزنگ معیاری اور مضامین وغیرہ کافی دلچسپ اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ البتہ قومی اردو کونسل کی جانب سے بچوں کے لیے جو کتابیں شائع کی گئی ہیں وہ کافی مہنگی ہیں۔ طلبہ خصوصاً دیہات کے بچے تو اس کو خرید کر پڑھ ہی نہیں سکتے۔ میں ایک گاؤں میں بحیثیت اردو معلم کے تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اس دیہات میں لوگ معاشی اور مالی طور پر کمزور ہیں۔ ایسے میں بچوں کے لیے اتنی مہنگی کتب خریدنا نہایت ہی مشکل ہے۔ محکمہ تعلیم، حکومتِ کرناٹک کی بھی ایسی کوئی اسکیم نہیں ہے جس کے ذریعے ہم اردو میڈیم کے طلبہ کو اردو کی معلوماتی کتب فراہم کرسکیں۔ آج کے اس مسابقتی دور میں طلبہ کے لیے نصابی کتب کے علاوہ جنرل نالج کی کتب کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے۔

کونسل کی شائع کردہ بچوں کی کتابیں معیار اور طباعت کو مدِنظر رکھتے ہوئے بے حد سستی ہیں نیز ان پر طلبہ و اساتذہ کو چالیس فی صد کی رعایت بھی دی جاتی ہے۔

(ادارہ)

■ فیصل ادیب، جنرل سکریٹری، شمسی بیابی انجمن ہند، 127، کٹرہ شہاب خاں، اٹاوہ

موقر رسالہ "اردو دنیا" قریشیہ لائبریری، اٹاوہ میں دیکھنے کو ملا۔ یہ ایک بہترین رسالہ ہے۔ اس کے مضامین معلوماتی اور وقیع ہوتے ہیں۔ گیٹ اپ کے اعتبار سے بھی یہ اردو کے رسائل میں ممتاز ہے۔ اگر اس رسالے میں اردو کے ان ممتاز ادبا اور شعرا کے حالات کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جائے جو گمنام ہوگئے ہیں تو یہ ہم نوجوانوں کے لیے معلومات افزا ہوگا۔

■ امجد جاوید، حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، گلبرگہ

اپریل کا "اردو دنیا" نظر نواز ہوا۔ جناب رفیق زکریا کے مضمون "اسلام اور دہشت گردی" میں باتیں ٹھیک ہیں لیکن ان دنوں ان کے سوچنے کا ڈھنگ کچھ بدل سا گیا ہے۔ جناب گوپی چند نارنگ کی باتیں بڑی معنویت رکھتی ہیں۔ جیسے "اردو زبان ہندستانی زبانوں کا تاج محل ہے" اور "دنیا میں میری پہچان اردو کے حوالے سے ہے" وغیرہ وغیرہ۔ آپ کا اداریہ فکر انگیز ہوتا ہے، پہلے وہی پڑھتا ہوں۔

■ پیارے ہتاش، ہودھ درشن گیٹ لین، اولڈ جانی پور، جموں

ماہنامہ "اردو دنیا" مسلسل آرہا ہے۔ خوب سے خوب تر۔ یہ رسالہ جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے، واقعی قابلِ تحسین ہے۔ ہماری نیک دعائیں آپ کے شاملِ حال ہیں۔

□□□

ہماری بات

بھیشم ساہنی کی موت کے ساتھ ہی ہندی کہانی کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کے جیسا وژن، انسانی سرشتوں کی پیچیدگی پر گرفت، عصری مسائل و موضوعات اور واقعات و حادثات کے فنکارانہ اظہار کی قدرت ہندی کے کم ہی ادیبوں کے حصے میں آئی۔ آزادی کے بعد کے ہندی فکشن میں پریم چند کے زیر اثر عام آدمی کے مسائل اور سماجی زندگی کے مظاہر کو جو مرکزیت حاصل رہی، بھیشم ساہنی کی کہانیاں اس کی ایک مثال ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں میں پریم چند کی روایت کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ بھیشم ساہنی کی دوور جن سے زیادہ کہانیاں ایک حقیقت پسند اور حقیقت نگار ادیب کے طور پر ان کی شناخت قائم کرتی ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ ہے۔ تکنیک میں بھی انھوں نے نئے تجربے نہیں کیے — لیکن عصر حاضر کے مختلف مسائل کی عکاسی انھوں نے اس طور پر کی کہ ہندی ادب ایک نئی جہت سے روشناس ہوا۔ روزمرہ کے واقعات کا سادہ مگر فنکارانہ بیان بھیشم جی کے ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کا بنیادی وصف ہے۔ ان کا رشتہ اگر ایک طرف روایت سے ہے تو دوسری طرف جدت سے بھی ہے۔ ان دونوں کی خوبصورت آمیزش سے انھوں نے اپنی تخلیقات کا تانا بانا تیار کیا ہے۔

بھیشم ساہنی خوابوں کے بجائے حقیقت کی دنیا میں رہنے والے انسان تھے اور یہی وجہ ہے کہ "تمس" ہو یا "امرت سر آگیا" یا "وانگ چو" یا "چیف کی دعوت" یا "نیلو، نیلما — نیلوفر" یا "کبیرا کھڑا بازار میں" یا "معاوضے" — مصنف کا ہر لفظ اس کے نجی تجربے کی بھٹی میں تپ کر کندن بنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں زبردست اثر انگیزی نظر آتی ہے۔ لیکن انھوں نے کہیں بھی نری حقیقت نگاری (جو بعض اوقات فوٹو گرافی بن جاتی ہے) نہیں کی بلکہ فنی تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

بھیشم ساہنی نے ہندستانی عوام کی زندگی، خوشی اور غم، آرزوؤں اور حسرتوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں مصنوعی کردار نہیں ملتے۔ یہ کردار ہماری روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قاری ان سے اجنبیت نہیں اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں متوسط طبقے کو مرکزیت حاصل تھی جو بدلتے وقت کے ساتھ چلنا چاہتا ہے اور اس راہ میں وہ اپنی ہی اقدار سے متصادم ہوتا ہے۔ اُن کے اِن کرداروں کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ کچھ کردار ایسے ہیں، جن کا اپنی تہذیب اور روایات سے رشتہ برقرار ہے اور کچھ کردار پرانے سماجی بندھنوں سے آزاد ہو چکے ہیں۔

بھیشم جی ماضی کی طرف بھی جھانکتے ہیں لیکن جذباتی ہو کر نہیں۔ دراصل وہ حال کے تضادات اور ستم ظریفیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تہہ تک جانا چاہتے ہیں۔ جیسے ڈرامہ "مادھوی" میں مہابھارت کے عہد کو کھنگالتے ہوئے وہ موجودہ مرد اساس سماج کی سوچ کو اجاگر کرتے ہیں۔ یا جیسے ہرنام سنگھ پر وار کرنے، نہ کرنے کی رمضان کی کش مکش کو بیان کرتے ہوئے بھیشم جی نے لکھا ہے کہ "مذہبی جنون اور نفرت کے اس ماحول میں ایک پتلی سی لکیر کہیں پر ابھی کھنچی ہوئی تھی جسے پار کرنا بہت مشکل تھا۔ "لکیر بھلے ہی پتلی ہو لیکن یہ اس بات کی مظہر ہے کہ ابھی کہانی کار کا انسانیت پر اعتبار قائم ہے، انسان اور انسانیت کا وجود خطرے میں نہیں ہے۔ یہ یقین اور اعتبار "تمس" ہی نہیں، بھیشم جی کے تمام ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کے کرداروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کی عکاسی وہ اپلیش دے کر نہیں بلکہ قصے کا جزو بنا کر کرتے ہیں۔

بھیشم جی کی عظمت یہی ہے کہ فن ان کی زندگی کا بنیادی مقصد اور ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انھوں نے "تمس" سیریل میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ سابق سوویت یونین میں سات برس ماسکو میں رہ کر انھوں نے ٹالسٹائے اور دیگر ممتاز روسی ادیبوں کی تخلیقات کے ہندی ترجمے کیے اور ہندی ادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل فنکار تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، اپنی محنت، لگن اور خداداد صلاحیت کی بنا پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انھیں ہندی کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے قارئین میں بھی مقبولیت حاصل تھی اور ان کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے کئی زبانوں میں بشمول اردو ہوئے اور قارئین نے انھیں پسند کیا۔

بھیشم جی بڑے فنکار ہی نہیں، بڑے انسان بھی تھے۔ خلوص اور نرم مزاجی ان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ وہ سستی شہرت حاصل کرنے کے ہتھکنڈوں سے دور رہ کر پوری زندگی ادب کی خدمت کرتے رہے۔ آج بھیشم جی کے روپ میں ہم ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں جو زندگی کی عمومیت میں پوشیدہ خصوصیات کی عکاسی پر قادر تھی اور جو زندگی بھر ایک غیر استحصالی اور خوش حال سماج کا خواب دیکھتی رہی۔ بھیشم جی کو بہترین خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ہم ملک میں رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی سمت میں کام کریں۔

□□□

وی. ایس. مہاجن

گیسٹ کالم

دیہی بچوں کی تعلیم

ملک میں ابھی اسکول ایجوکیشن خصوصاً ابتدائی درجات کی تعلیم کے لیے ایک قابلِ عمل پالیسی پر مفید و کار آمد بحث ہونی باقی ہے۔ درحقیقت ہمارے یہاں بہت سارے اسکولوں کا وجود برائے نام ہے۔ یہاں تک کہ وہ بنیادی ڈھانچے سے بھی محروم ہیں۔ دیہی علاقوں میں ان کی حالت اور بدتر ہے۔ گرچہ اساتذہ کی تقرری دیہی اسکولوں میں حکومت نے کر دی ہے لیکن ان میں سے اکثر اپنی ڈیوٹی پر نہیں آتے اور جو آتے بھی ہیں ان کو اسکول کی ترویج و ترقی اور درس و تدریس میں بہت کم دلچسپی ہوتی ہے۔ اساتذہ کی عدم دلچسپی کے کئی وجوہات ہیں۔ ان میں اکثر عورتیں ہیں جن کے ذمے اور دوسرے کام بھی ہوتے ہیں اور اکثر اساتذہ شہر میں رہتے ہیں اور دور دراز دیہی علاقوں میں جہاں ان کی تقرری ہوئی ہے، پہنچنا مشکل ہوتا ہے اور جن کو دلچسپی بھی ہے وہ بھی بنیادی ڈھانچے کے فقدان اور ذمے داران کی عدم توجہی کے باعث بیزار ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کو عالمگیر بنانے کی ناکامی کی اصل وجہ ہے ارد گرد کے اسکول جانے والی عمر کے نہایت کم بچوں کا اس سے استفادہ کرنا اور درمیان میں ہی اسکول چھوڑنے کی شرح میں کثرت۔ اس کے علاوہ بہت سے والدین کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ ان کا لڑکا تعلیم پا کر ایک اچھا انسان بن سکے گا۔ اس کے علاوہ وہاں تدریس، نصابِ تعلیم اور کتابوں کا ابھی کوئی یکساں نظام بھی نہیں ہے۔

جہاں تک نیشنل اسکول ایجوکیشن پالیسی کا تعلق ہے۔ اس کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ابتدائی اور ہائی اسکول کی سطح پر تدریس کا ایک ترقی یافتہ لائحہ عمل وضع کیا جائے جسے قومی سطح پر نافذ کیا جا سکے۔ اور دیہی پس منظر کو سمجھنے کے بعد وہاں کے طلبہ کے تعلیمی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معیاری کتب تیار کرنا چاہیے۔ یہ کتابیں بچوں میں تقسیم کر کے ان کے ردِ عمل اور ان کی نئی دلچسپی کو جاننا چاہیے۔ اس کے بعد علاقائی زبانوں کے ماہرین سے معیاری کتابوں کا ترجمہ کروا کے طلبہ میں تقسیم کرنا چاہیے۔ کتابوں کو بھی نیشنل اسکول ایجوکیشن پالیسی (National School Education Policy) وضع کرنے کا پہلا مرحلہ تصور کرنا چاہیے۔

اساتذہ کو بھی ان اصولوں اور طریقۂ کار سے مکمل آگاہی اور واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ انھوں نے جو تعلیم اعلا تعلیمی اداروں میں حاصل کی ہے اور دیہی علاقوں میں بچوں کو پڑھانے میں ان سے جو توقع کی جاتی ہے، دونوں میں کافی فرق ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر موجودہ نظامِ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں لانی مقصود ہیں تو طریقۂ تعلیم اور اساتذہ کی ٹریننگ میں تبدیلیاں لانی ہوں گی۔

شہر میں پلے بڑھے اور اعلا تعلیم یافتہ اساتذہ جو عام طور سے دیہی ماحول کے لیے غیر موزوں ہوتے ہیں کی تقرری گاؤں میں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسری جانب اگر کوئی معلم دیہی علاقے سے تعلق رکھتا ہے اور اپنے اسکول کے گرد و نواح میں رہتا ہے تو وہ اپنی ذمے داری زیادہ بہتر طریقے سے پوری کر سکتا ہے۔ علاقائی اساتذہ جو ہائی اسکول کے بعد ایک سالہ لیجر ٹریننگ کر چکے ہوں، اپنا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ وہ اساتذہ جو زمین سے جڑے ہوں، ان کی تقرری سے درمیان میں ہی اسکول چھوڑنے کی شرح میں کمی آئے گی۔ ابتدائی تعلیم کو جلد ہی عام کرنے کی رو میں کچھ بنیادی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کو عام کرنے سے قبل کچھ ضروری اور بنیادی سہولتیں بہم پہنچانی ہوں گی اور اساتذہ کو تعلیم عام کرنے میں بنیادی کردار ادا کرنا ہوگا۔

(بشکریہ: "وی ہندو" 20 مئی 2003)

□□□

مترجم: ابو شحیم خاں
16, (Old) Mahanadi Hostel
JNU, New Delhi-110067

تحریر و ترجمہ: فیروز بخت احمد

اردو کی ترقی کے نئے امکانات

26 سالہ نوجوان عبدالاحد آج بطور ایک ڈی ٹی پی ایکسپرٹ اردو روزنامہ "راشٹریہ سہارا" میں برسر روزگار ہے اور ایک اچھی تنخواہ پا رہا ہے۔ عبدالاحد ہی نہیں آج اور بھی بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو ڈی ٹی پی ٹریننگ حاصل کر کے اچھے مقامات پر روزگار پا چکے ہیں۔ اس کا کریڈٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کی طرف سے چلائے جانے والے تقریباً 125 کمپیوٹر مراکز کو جاتا ہے جو مرکزی وزارت ترقی انسانی وسائل کی نگرانی میں چل رہے ہیں۔ کارگل سے کنیا کماری اور تری پورا سے گوا تک مختلف مدارس، خانقاہوں اور اردو اداروں میں چلنے والے ان ڈی ٹی پی سینٹرز سے ہزارہا مسلم بچے فیضیاب ہو رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا کہنا ہے کہ اب تک 11000 سے زائد طالب علم ڈی ٹی پی کا ڈپلوما سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے 70 فیصد سے زیادہ تربیت یافتہ حضرات کو اچھی جگہوں پر ملازمتیں بھی مل چکی ہیں۔ اس کا سہرا جناب مرلی منوہر جوشی کے سر ہے جنھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ نہ صرف اس پروگرام کو بڑھاوا دیا بلکہ اس میں گہری دلچسپی لی۔

کل ہند پیمانے پر 22 ہندستانی صوبوں میں آج بھی تقریباً 10,000 طالب علم قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر پروگراموں سے وابستہ ہیں جن میں تقریباً 50 فیصد لڑکیاں ہیں۔ اس پروگرام کا مقصد مسلم بچوں کو تعلیمی اعتبار سے مستحکم کرنا ہے۔

ممبئی کے مشہور اردو روزنامہ "انقلاب" میں کام کرنے والے محمد ندیم نے ڈی ٹی پی سے آگے بڑھ کر گرافکس میں بھی مہارت حاصل کر لی اور آج وہ اس کی ڈیزائننگ کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

مشہور مکالمہ نگار، گیت کار، فلم ساز اور شاعر گلزار کا کہنا ہے کہ قومی اردو کونسل کی سب سے بڑی کامیابی اردو لٹریچر کو فروغ دینا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی عظیم کام ہے جس میں بچوں کی کہانیوں کی کتابوں کی اشاعت بھی شامل ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس پر اردو داں حضرات نے صحیح معنوں میں توجہ نہیں دی تھی۔ یہ کتابیں رنگین تصاویر کے ساتھ بہت خوبصورت انداز میں چھاپی گئی ہیں اور ان میں سے بعض انگریزی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کرائی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں کونسل نے صوبائی اردو اکادمیوں کی توجہ بھی اس کام کی جانب مبذول کرائی ہے۔

گزشتہ پانچ برسوں میں حکومتِ ہند نے اردو کے لیے فنڈ میں تقریباً 950 فیصد اضافہ کیا ہے۔ تقریباً پانچ سال قبل کونسل کا سالانہ بجٹ لاکھوں میں تھا مگر اب یہ کروڑوں میں ہے۔ جو ایک بڑا قدم ہے کیوں کہ کانگریس کی سرکار کے 40 سالہ دور میں کبھی اتنا پیسہ اردو کی ترویج و ترقی پر خرچ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوشی صاحب کو نہ صرف اردو بلکہ فارسی سے بھی خاص انسیت ہے۔ انھوں نے بچپن میں یہ دونوں زبانیں پڑھی تھیں اور اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار انھیں ازبر ہیں۔

ایک تقریب میں ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے کہا کہ ہندی کے ماتھے پر اردو ایک چمکدار بندی کی مانند ہے۔ اُن کے الفاظ تھے "میں اپنے ہندی کے چہرے پر اردو کا تلک لگاتا ہوں!" اُن کا یہ سوچنا بالکل بجا ہے کہ اردو ہندستان کے ملے جلے کلچر کی بہترین پہچان ہے۔

حیدرآباد کے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے طالب علم مولانا محمد فرحان اعظم قاسمی کا کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ زیادہ تر مسلمان بی جے پی کو ووٹ نہیں دیتے پھر بھی ڈاکٹر جوشی بغیر کسی مفاد اور نام و نمود کی تمنا کے اردو کی خدمت کیے چلے جا رہے ہیں۔

قومی اردو کونسل کے تقریباً 125 سینٹرز میں اردو، انگریزی اور ہندی خطاطی اور گرافک ڈیزائننگ کی ٹریننگ کل ہند پیمانے پر 20 صوبوں اور 59 ضلعوں میں دی جا رہی ہے۔ اس کام کے لیے 5 ہزار سے زیادہ ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کورسیز کے لیے لڑکیوں میں بھی اتنا ہی جوش و خروش ہے جتنا لڑکوں میں۔ یہی وجہ ہے کہ رانچی اور بنگلور میں مسلم لڑکیوں کے لیے علاحدہ کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی سینٹر تشکیل دیے گئے ہیں۔

ہر سال قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام "اردو کتاب میلے" کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یہ اردو میلہ دنیا میں اپنی طرز کا ایک نرالا ہی میلہ ہوتا ہے جس میں اردو کتابوں اور رسالوں میں دلچسپی رکھنے والے لوگ آتے ہیں، کتابیں خریدتے ہیں، ثقافتی پروگراموں سے محظوظ ہوتے ہیں، اسٹالوں سے کھانے پینے کی چیزیں لیتے ہیں اور ایک اچھا دن گزار کر اپنے گھر جاتے ہیں۔

اردو اخبارات کو معیاری بنانے کے لیے اردو کونسل نے یو. این. آئی.

کی ٹیلی پرنٹر سروس بھی انھیں فراہم کی ہے۔ آج تقریباً پچاس اردو اخبار یو. این. آئی. کی اردو سروس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

اردو کی ترویج وترقی کے لیے اردو کونسل نے مختلف مقامات پر موبائل وین کے ذریعے چلتی پھرتی اردو بک اسٹال کا پروگرام بھی شروع کیا ہے۔ موبائل وین ملک کے مختلف صوبوں اور ضلعوں میں جاتی ہے جہاں لوگ اپنی پسند کی کتابیں خریدتے ہیں۔ کونسل کا ماہنامہ رسالہ "اردو دنیا" ایک ایسا جامع اردو ماہنامہ ہے جس کی ہمسری اردو کا کوئی دوسرا رسالہ نہیں کر سکتا۔ اس میں تمام دنیا میں ہونے والے اردو پروگراموں کی خبریں تو چھپتی ہی ہیں، بڑے معیاری مضامین بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ کونسل ایک سہ ماہی رسالہ "فکر و تحقیق" بھی نکالتی ہے۔

اردو کونسل کا ایک اور بڑا کام "اردو انفارمیٹکس" (Urdu Informatics) شعبے کی شروعات ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا ماننا ہے کہ آج کی دنیا انفارمیٹکس کی دنیا ہے اور ہندستان اس شعبے میں کسی سے پیچھے نہیں تو اردو کیوں پیچھے رہے؟ وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند نے اس کے لیے ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔ اس شعبے کے ذریعے اردو انفارمیٹکس میں بہت سے کورس کرائے جائیں گے جن سے اردو اور ٹیکنالوجی کے درمیان فاصلے ختم ہوں گے۔

اردو پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ زبان تقسیم ملک کی ذمے دار ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو اس بات کا افسوس ہے کہ کچھ لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ اس قسم کا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو ہمیشہ سے ہی ایک قومی نظریے کی حامی رہی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے، وہ سماج میں انتشار پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اردو کا رشتہ سیاست سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ اردو بلا لحاظ مذہب وملت پورے ملک میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ اردو ہندستانی ثقافت کی پہچان ہے جس نے ہمیشہ پیار اور محبت کے پل بنائے ہیں۔

(بشکریہ "نیوز ٹائمز" حیدرآباد)

□□□

A-202 Adeeba Market and Apartments,
Near Rehmani Masjid,
Main Road, Zakir Nagar, Okhla,
New Delhi-110 025

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Human Resource Development,
Department of Secondary & Higher Education, Govt. of India.

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے معاون نصابی کتابیں بروقت فراہم کرنے کی غرض سے سائنس، جدید ریاضی اور سماجی علوم پر آٹھویں تا دسویں جماعت کے لیے درج ذیل کتابیں شائع کی ہیں۔

1- نباتیات (Botany)
2- حیوانیات (Zoology)
3- طبعیات (Physics)
4- کیمیا (Chemistry)
5- جدید ریاضی (Modern Mathematics)
6- علم شہریت (Civics)
7- طبعی جغرافیہ (Physical Geography)
8- تاریخ ہند (History of India)
9- معاشیات (Economics)
10- کامرس (Commerce)

یہ معاون درسی کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شاخ جنوبی ہند 5-4-435/20 گرین ہاؤس دوسری منزل، نامپلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد-500001 سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

فون نمبر: 040-24615139

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% رعایت دی جاتی ہے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: دلیپ کے. ڈورا / اشوک نندا
ترجمہ: فضیل احمد خاں

تعلیم میں اقدار کا بحران

موجودہ نظامِ تعلیم ہمارے مادی رویّے کی ایک مکمل تصویر ہے۔ یہ طلبہ کے اندر قوتِ فکر پیدا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ موجودہ نظامِ تعلیم طلبہ کو یہ نہیں بتاتا کہ وہ کسی شے کی تہہ میں کیسے جائیں اور پھر اس کی جزئیات کے بارے میں کیسے معلومات حاصل کریں۔ یہ نتیجہ ہے ایک قسم کے بے حس تعلیمی رویّے کا جس کو اساتذہ کے ایک بڑے گروہ نے پروان چڑھایا ہے۔

اگر ہم موجودہ نظامِ تعلیم کا بغور تجزیہ کریں تو پتہ چلے گا کہ بدقسمتی سے ہمارے عظیم ماہرینِ تعلیم کے تصورات کا اس میں خیال نہیں رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ نظامِ تعلیم ذہین اور ماہر طلبہ پیدا کرنے میں تو کامیاب رہا لیکن طلبہ کو بہتر اقدار سے مزین نہ کرپانے کے باعث یہ ان میں ملک و قوم کی صحیح خدمت کا خاطر خواہ جذبہ پیدا نہیں کر سکا۔ موجودہ طریقۂ تعلیم کے تجزیے کا یہ ایک مناسب وقت ہے اور اس موضوع پر ایک قومی سطح کی بحث کرانے کی ضرورت ہے تاکہ ہم ایک ایسے مکمل نظامِ تعلیم کو فروغ دے سکیں جس میں ماضی و حال کے اہم ماہرینِ تعلیم کے خیالات و افکار کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ یہ تو طے ہے کہ ایک خاص نظامِ تعلیم جو اسلاف اور ماہرینِ تعلیمات کے افکار پر مبنی ہو، صحیح معنی میں ایسے اعلا اقدار کے حامل اور کارگزار دانشور اور مفکر پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگا جو نسلِ آدم کو ترقی و بلندی کی راہ میں اور آگے بڑھا سکیں گے۔

تعلیم میں نظامِ اقدار — ایک معنی خیز تصور:

قدیم ہندستان کا ایک کامیاب سفارت کار کوٹلیہ، تعلیم کو "ملک کی خاطر تربیت اور قوم کی محبت" کے معنوں میں لیتا ہے۔ ودیکانند، تعلیم کی توضیح کچھ اس طرح کرتے ہیں "تعلیم اس الوہی تکمیل کا مظہر ہے جو پہلے ہی سے انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔" "اعلا تعلیم وہ ہے جو نہ صرف ہم کو معلومات فراہم کرائے بلکہ ہماری زندگی میں دوسرے موجودات کے ساتھ ہم آہنگی بھی پیدا کرے۔" یہ خیال ہے ایک عظیم مفکر تعلیمات رابندر ناتھ ٹیگور کا۔ ایک عظیم فلسفی جے کرشنا مورتی کے مطابق "تعلیم کسی اندھی تقلید کا نام نہیں ہے بلکہ تعلیم خود کے لیے سچائی کی جستجو کا نام ہے۔"

اگر ہم مذکورہ بالا نظریات کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ انسانی شخصیت کی مختلف جہات مثلاً جسمانی، ذہنی، اخلاقی، جذباتی، جمالیاتی، سماجی اور روحانی جہات میں متوازن ترقی سچی تعلیم کی بنیاد ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد انسان کی اندرونی طاقت کا ادراک ہے جو بالآخر انسان کی مکمل ترقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تعلیم کے اس معنی کو عملی جامہ پہنا کر دہشت گردی اور عالمی جنگ کے امکانات کو کم کیا جاسکتا ہے اور دنیا میں امن و امان قائم کیا جاسکتا ہے۔

قدیم ہندستان کی تہذیب اور ثقافت کے نظامِ تعلیم کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ موجودہ نظامِ تعلیم کے تاثر کے موازنے میں معاون ثابت ہوگا۔ کسی زمانے میں ہندستان عظیم تہذیبی ورثے سے مالامال تھا۔ تمام دنیا کو قدیم ہندستان کی کامیابیوں پر، چاہے وہ علم ریاضی میں ہوں یا علم نجوم میں، طب میں ہوں یا انجینئرنگ میں، حیرت تھی۔ اشوکِ اعظم کے الفاظ میں "ہندستان کی فتح دھرم اور سچائی کی دین تھی۔" رگ وید میں زندگی کے دو مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ ہمیں اپنی روحانی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی سماجی ذمے داریوں کو بھی پوری دیانت داری کے ساتھ نبھانا چاہیے۔ صداقت اور حسن ہندستانی تہذیب کے لازمی جزو ہیں۔ قوتِ برداشت، عدم تشدد اور محبت کے ذریعے قدیم ہندستان نے اپنی فتح کا پرچم لہرایا تھا۔ رام کرشن پرم ہنس نے کہا تھا "ہم جب تک زندہ ہیں، کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔"

عہدِ قدیم کے حکما زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے اور اس کو منظم ترین بنانے کی ہر چند کوششیں کرتے تھے تاکہ ہم میں سے ہر شخص کی بہترین کاوشوں کو بروئے کار لا کر زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔ وہ لوگ اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے بجائے عام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ ان کے لیے معیارِ زندگی کا مطلب وہ اعلا ابدی اقدار تھے جو سچائی، محبت، رحم دلی اور پاکیزہ کردار پر مبنی ہوتے تھے۔

اس دور کے لوگوں میں اخلاقی اقدار کی بلندی کا سہرا بہت حد تک گرو کُل کے نظامِ تعلیم کو جاتا ہے جس کا بنیادی مقصد یہی ہوتا تھا کہ طالبِ علم کسی روشن ضمیر انسان کی صحبت میں رہے اور اس سے ہر وہ چیز سیکھے جو وہ سیکھ سکے۔ اس نظامِ تعلیم کا پہلا سبق بردباری، رواداری اور محبت پر مبنی ہوتا تھا۔ اس عہد کے گرو اور گروماتا (استاد کی بیوی) طلبہ کے ساتھ خود اپنے بچوں

جیسا سلوک کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں شاگرد بھی اساتذہ کو اپنے والدین اور سرپرست کا درجہ دیتے تھے۔ گروکل کا نظامِ تعلیم طلبہ کو پاکیزگی اور خاکساری کا سبق سکھلاتا تھا اور ان کے اندر علم کی سچی پیاس اور تڑپ پیدا کرتا تھا تاکہ طلبہ صحیح معنوں میں علم حاصل کریں اور اس کو محفوظ بھی رکھ سکیں۔

پار ودیا (परविद्या) اور اپار ودیا (अपरविद्या) قدیم ہندستان کی مکمل تعلیم کے جزو تھے۔ پار ودیا ایک کم درجے کا علم ہے جو اس دور کے سائنس، ہیومینٹیز (Humanities) فنون اور دستکاری سے عبارت تھا۔ اس کے برخلاف اپار ودیا جس کو برہماودیا بھی کہا جاتا ہے۔ اس علم کا نام ہے جس کے ذریعے ہر طالبِ علم اپنی لازوال روح کو محسوس کرتا ہے۔ اس دور کی اعلا تعلیم ایک ایسی روح کا پتہ دیتی ہے جو ساری کائنات کو محیط ہے اور تمام موجودات میں اس کی جلوہ نمائی ہے۔ اس دور کا علم یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام انفرادی روحیں اسی روحِ اعظم کا پرتو ہیں۔ افراد اور سماج ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ اس طرح پیار، رحمدلی اور خدمتِ خلق کا جذبہ اس دور کے حقیقی تعلیم یافتہ لوگوں میں موجزن ہوتا تھا۔ لوگ صرف کارآمد مقاصد کے لیے ہی اپنے علم کا استعمال کرتے تھے اور منفی چیزوں میں اس کے استعمال سے گریز کرتے تھے۔ یہ سب کچھ صرف انسان کے اعلا کردار اور اس کی تہذیب کی وجہ سے ہوتا تھا جس کو طالبِ علم اپار ودیا یا اعلا تعلیم کے ذریعے حاصل کرتا تھا۔

اقدار کا تعلق کسی خاص میدانِ عمل سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے ہوتا ہے۔ اقدار کی مختلف قسمیں ہونے کے باوجود اخلاقی اقدار جنھیں ہم پارسائی، سچائی، رحمدلی اور مساوات وغیرہ کے نام سے جانتے ہیں، سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی، جمالیاتی، ادراکی اور روحانی اقدار بھی ہوتے ہیں اور ان سب کا شخصیت کے کسی نہ کسی شعبے سے تعلق ہوتا ہے اور کسی بھی شخصیت کی مکمل نشوونما کے لیے ان سب کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ اقدار ایسے ہوتے ہیں جو خود میں مکمل سمجھے جاتے ہیں۔ انھیں اقدارِ کامل کا نام دیا جاتا ہے اور وہ اقدار جنھیں اعلا مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، آلاتی اقدار (instrumental values) کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ عہدِ قدیم کے ہندستان میں نظامِ تعلیم کا مقصد صرف مفکرین اور دانشور پیدا کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ تعلیم کو حقیقی زندگی میں اتار دیا جائے تاکہ زندگی انفرادی، سماجی، قومی اور روحانی سطح پر بہتر ہوسکے۔ تعلیم کو عہدِ قدیم میں ایک نئی زندگی کی تعمیر کا ذریعہ اور انسان کی آزادی کا پیامبر تصور کیا جاتا تھا۔ اس دور کی تعلیم ایک قسم کی روشن خیالی کو جنم دیتی تھی جس کے ذریعے انسان معلومات کا مخزن ہونے کے ساتھ ساتھ بلند کردار کا بھی حامل ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور کا نظامِ تعلیم ایسی اعلا شخصیات پیدا کرنے میں کامیاب رہا جن کا دل محبت، رحمدلی، خوداعتمادی، بے خوفی اور خدمتِ خلق کے اعلا جذبے سے لبریز ہوتا تھا۔ اس طرح قدیم ہندستان کے نظامِ تعلیم کا اس دور کی تہذیب سے گہرا تعلق تھا۔

اگر ہم عصرِ حاضر کے نظامِ تعلیم کا قدیم ہندستان کے نظامِ تعلیم سے موازنہ کریں تو یہ بات بخوبی واضح ہوجائے گی کہ موجودہ نظامِ تعلیم مکمل انسان پیدا کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ آج کے اس نئے دور میں ہمیں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ ہے کامل انسان اور مکمل شہری۔ لیکن مروجہ نظامِ تعلیم ایسے عناصر سے محروم ہے جو نوجوانوں میں ایسے اقدار پیدا کرسکے جن کی بنیاد پر وہ ایک حقیقی شہری کی حیثیت سے انسانی خدمت کے لیے آگے بڑھیں۔

ہندستانی نظامِ تعلیم میں اقدار — ایک مشکل ہدف:

یہ بھی سچ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہندستان کا قدیم نظامِ تعلیم مغرب کے زیرِ اثر اپنی چمک دمک اور افادیت کھوتا رہا اور وہ نظامِ تعلیم جس کو نوآبادیاتی حکومت نے اپنے مفاد کے پیشِ نظر تشکیل دیا تھا، آج بھی قائم ہے۔ میکالے (Macaulay) کا لایا ہوا نظامِ تعلیم ہمارے دلوں میں اپنے ہی رسم و رواج اور تہذیب کے خلاف حقارت پیدا کرنے میں کامیاب رہا اور زندگی کے طور طریقوں کے لیے ہمیں مغرب کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنے پر مجبور کردیا۔ آج اسکول، کالج اور یونی ورسٹیوں سے ہر سال لاکھوں طلبہ فارغ ہوتے ہیں لیکن وہ ملک اور ملک کے عوام کی خدمت کے بجائے اپنے مفاد کو اوّلیت دیتے ہیں۔ آج ہمارے یہاں اعلا تعلیم یافتہ لوگوں میں دوسرے ملکوں میں جاکر پیسہ کمانے کا رجحان عام ہوگیا ہے۔

عصرِ حاضر میں ہمارا ملک ایک قسم کے اخلاقی و تہذیبی المیے سے دوچار ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمارا تعلیمی نظام ایک سنجیدہ سماج کی تعمیر میں ناکام رہا ہے۔ آج لوگ اخلاقی گراوٹ، خوداعتمادی میں کمی، کردار کی پراگندگی اور روایتی نظم و ضبط میں کمزوری جیسے بحران سے دوچار ہیں۔ جائز و ناجائز طریقے سے منصب و دولت حاصل کرنے کا لالچ اس بیکار نظامِ تعلیم کی بنیادی وجہ ہے۔ آج منصوبہ بند جرائم، دھوکہ دھڑی اور دہشت گردی پر غور کیجیے، ان سب کے پیچھے کچھ ایسے بہترین دماغ کارفرما ہوتے ہیں جو تعلیم و تکنیک کی اعلا استعداد کے حامل ہوتے ہیں۔ آج لوگ بے ایمانی اور غیر اخلاقی طریقے سے پیسہ کمانے میں مصروف ہیں جو کہ ان کے پیشے، فرائض اور سماجی ذمّے داریوں کے مدِ نظر قطعی مناسب نہیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم

میں اقدار کو مسلسل نظر انداز کیا گیا ہے۔ آج ملک کے اتحاد کو خطرہ لاحق ہے۔ ہمارا ملک لسانی اختلافات، فرقہ وارانہ منافرت، خود غرضی چاروں طرف پھیلی ہوئی رشوت ستانی، نااہل ارباب سیاست، بدعنوان افسران اور ڈسپلن سے عاری دیہاڑ طلبہ کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے۔ ہمارا ملک ایک قسم کی بیزاری کا شکار ہے اور ہم تعلیم یافتہ دانشور لوگ بے حس و خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

آج کل بچے کی تعلیم کے معیار کا تعین امتحان میں حاصل کردہ نمبر، پوزیشن اور انعامات سے کیا جاتا ہے اور والدین اسی بات پر توجہ بھی دیتے ہیں کہ ان کے بچے امتحان میں اچھے نمبر لانے کے لیے اپنی تعلیم میں جی توڑ محنت کر رہے ہیں یا نہیں جبکہ امتحانات میں حاصل کردہ نمبر بچے کی شخصیت اور کردار کا آئینہ دار نہیں ہو سکتے۔ اچھا کردار امتحان میں اچھے نمبر لانے سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ آج کل کوئی بھی شخص یہ حقائق طلبہ کے سامنے نہیں پیش کرتا۔

عصر حاضر کا نظام تعلیم امتحان سے اس قدر بندھا ہوا ہے کہ گویا ہمارے پاس کوئی نظام تعلیم ہے ہی نہیں، بلکہ صرف نظام امتحان ہے۔ موجودہ نظام تعلیم صرف نوکری حاصل کرنے کا پاسپورٹ بن کے رہ گیا ہے۔ آج ہمارا نظام تعلیم آہستہ آہستہ تعلیم سے اس کے بنیادی عنصر کو چھینتا جا رہا ہے۔

موجودہ دور اطلاعاتی تکنیک (Information Technology) کا ہے۔ آج کمپیوٹر پر مبنی طریقۂ تعلیم نے اُس نظامِ اقدار کو بہت پیچھے ڈھکیل دیا ہے جس پر ہمارے اسلاف زور دیا کرتے تھے اور یہ خود سر فہرست آ گیا ہے۔ آج لوگوں کو ایلیٹ (Eliot) کے دنیا کے بارے میں اسی خدشے سے آگاہ کرانا چاہیے کہ علم (knowledge) اطلاع (Information) کے ہاتھوں شکست کھا جائے گا۔ کمپیوٹر نے انسان اور مشین کے درمیان کے فرق کو گھٹا دیا ہے۔ مزید برآں نصاب کے بھاری بھرکم بوجھ نے طلبہ کو ٹینشن پر بھروسہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ طلبہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے ذہن اور قوتِ فکر پر زور دیں، وہ اپنی یادداشت پر تکیہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بہترین نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے یہ ضروری تو نہیں کہ وہ بہت سوجھ بوجھ والے بھی ہوں اور ہمارے سماجی کام میں کوئی اہم تخلیقی کارنامہ بھی انجام دے سکیں۔

یہ منفی اقدار تو ہم نے یورپ سے لے لیے لیکن اس کے برعکس ہم نے اس بات پر شاذ و نادر ہی غور کیا کہ ہمیں طلبہ کو کیسی تعلیم دینی چاہیے۔ آج کی تاریخ میں بہترین تعلیم وہ ہے جو طلبہ کو کسی میدان کا ماہر بنائے۔ ماہر اسے کہا گیا ہے جو چھوٹی چھوٹی چیز کے بارے میں بھی وسیع معلومات حاصل کرتا ہے اور اپنی معلومات میں ہمیشہ اضافہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے میدان کی غیر موجود چیز کے بارے میں بھی ساری معلومات جمع کر لے۔ ایسا نظامِ تعلیم کوئی ایسا فرد نہیں پیدا کر سکتا جس کا کوئی اپنا وجود ہو جبکہ ہمارے سارے ذرائع کا استعمال صرف ماہرین پیدا کرنے پر ہی صرف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لیا قتی امتحان پاس کر لینے سے کوئی آدمی کارگزار، لائق، کامیاب اور حقیقت پسند استاد نہیں بن سکتا۔ استاد ہونے کے لیے صرف سند اور مارک شیٹوں (marksheets) کا جمع کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔

ہمارے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آج تعلیمی میدان ایک قسم کی گراوٹ اور اخلاقی بحران کا شکار ہے اور موجودہ نظامِ تعلیم ایسے افراد پیدا کرپانے سے قاصر ہے جو ہماری قدیم روایات کے بہترین آدرشوں کو اپنانے کے لیے آواز اٹھا سکیں۔ اس وقت حالات بہت پیچیدہ ہیں کیونکہ اس نظامِ تعلیم نے صرف مادّہ پرستی، خود غرضی اور ظاہری دانشوری کو جنم دیا ہے۔ اخلاقی گراوٹ تو بالکل ظاہر ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں اخلاقی اقدار کو بہت زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف خاص توجہ دی گئی ہے لیکن ایسی پیشہ ورانہ تعلیم جو اخلاقی روح سے خالی ہو، ملک کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی۔

ہاں تاریکی کے اس دور میں امید کی ایک کرن اب بھی باقی ہے جس سے ہمارے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ مجوزہ نظامِ تعلیم میں ایسے اقدار کے شامل کیے جانے کی ضرورت ہے جو ملک کو ایک بار پھر قابلِ فخر طریقۂ تعلیم عطا کر سکے۔ آج کل اس موضوع پر ملک کے کونے کونے میں بحثیں چل رہی ہیں اور ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ موجودہ نظام کی غلطیوں سے واقف ہو چکا ہے اور اس کا حل بھی تلاش کر رہا ہے لیکن افسوس کہ اس قسم کے خیالات اب بھی بحث و مباحثے تک محدود ہیں اور ان پر عمل کیا جانا باقی ہے۔

پالیسی ساز حضرات کے لیے یہ بہت اہم وقت ہے کہ وہ اس امر کی طرف توجہ دیں اور کچھ اثر آفریں مشوروں کے ساتھ میدان میں آئیں تاکہ موجودہ نظامِ تعلیم میں اقدار کی روح پھونکی جا سکے اور اس میں ہمارے اسلاف کی جھلک دکھائی دے اور یہ طلبہ کو ان کے متوقع ہدف تک پہنچا سکے۔

قدیم نظام کی طرف مراجعت:

اکیسویں صدی میں تعلیم پر یونیسکو (NNESCO) کی رپورٹ بعنوان "Learning: The Treasure Within" (تعلیم: پوشیدہ صلاحیتیں) میں بھی ایسی ہی تعلیم کی وکالت کی گئی ہے جس کا سماج و تہذیب سے گہرا تعلق ہو اور جو ترقی کی ضامن ہو۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "بہترین اور مکمل شخصیت کا فروغ بغیر عمدہ نظامِ تعلیم کے جو ثقافتی، وراثتی اور روایتی اقدار

پر مبنی ہو، ممکن نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستانی وراثت، تہذیب اور اقدار کو مکمل طور سے سمجھا جائے اور اسے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلا تعلیم تک نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

مذکورہ بالا مقاصد کا حصول بہر حال ایک چیلنج ہے۔ لیکن اس نظامِ تعلیم کو اقدار سے بہرہ ور کرنے کی کچھ صورتیں ذیل میں پیش ہیں:

- ہم تعلیم تک مکمل رسائی اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب ہم اپنے اسلاف کے نصب العین کو عصرِ حاضر کی ضرورتوں سے جوڑ دیں۔
- یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ آج کل کے اساتذہ طلبہ کے اندر اچھے اقدار پیدا کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ سب سے پہلے اساتذہ کو اقدار پر مبنی تعلیم دی جانی چاہیے۔ اگر اساتذہ صالح اقدار تعلیم سے آراستہ ہوں تو طلبہ خود بخود اقدار سے بہرہ ور ہو جائیں گے۔ اسی لیے اساتذہ کی تقرری کے وقت ان کی مؤثر تعلیمی لیاقت پر خاص دھیان دینا چاہیے۔ اساتذہ تعلیمی پروگرام (Teacher Education Programmes) پر فوری توجہ کی ضرورت ہے جو کہ موجودہ وقت میں اقدار کی تعلیم کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کر پا رہی ہے۔
- اساتذہ کو چاہیے کہ پہلے وہ خود اپنی شخصیت کو نکھاریں، پڑھانے میں دلجمعی سے کام لیں اور اپنے سبجیکٹ میں دلچسپی پیدا کریں۔ سب سے زیادہ اہم ہے پڑھانے کا انداز، لہٰذا اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں بھرپور تعلیمی شعور کا مظاہرہ کریں۔
- ابتدائی تعلیم سے لے کر یونی ورسٹی تک طلبہ کو روحانی تعلیم دی جانی چاہیے۔ کھیل کود، ثقافتی سرگرمی اور مراقبے میں ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔
- وہ اساتذہ اور طلبہ جو پوری تن دہی کے ساتھ اپنے فرائض کے لیے تیار نہیں، اعلا تعلیم کے لیے قطعی مجاز نہیں سمجھے جانے چاہیے۔
- ایک ایسا نظامِ تعلیم تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں جاروب کش سے صدر مدرّس تک سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے بلکہ انھیں ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کی پریشانیوں کو سمجھ سکیں اور انھیں حل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ طلبہ کیا کرنا چاہتے ہیں، یہ سمجھنے کا موقع انھیں دیا جانا چاہیے۔
- طلبہ کے دلوں میں امن، سچائی، عدمِ تشدد اور رحم دلی جیسے عالمی اقدار کے فروغ کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔
- اہم ماہرینِ تعلیم کے ساتھ بیٹھ کر ایک نیا فلسفہ تعلیم تیار کرنا چاہیے جو موجودہ حالات کے موافق ہو۔
- تشخیصی تکنیک اور انتظامیہ کے بجائے طلبہ کو خود اساتذہ کی تعلیمی لیاقت کا اندازہ کرنے کا اختیار دینا چاہیے۔
- اساتذہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ طلبہ کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بنائیں، سخت سست کہیں یا پھر غیر مناسب طریقے سے ان کی تردید کریں۔ بلکہ اساتذہ کو تعلیم کا ایسا طریقہ اپنانا چاہیے جس سے طلبہ روحانی طور پر طاقتور، باہمت، جرأت مند اور دیانت دار ہو سکیں۔ آج طلبہ کو ایسی تربیت کی ضرورت ہے جس سے ان کی ذہنی نشو و نما ہو اور وہ دل و دماغ پر قابو رکھ سکیں۔ آج کا طالب علم ایسے مناسب افکار، اثر آفریں نمونہ جات اور متوازن رہنمائی کا سخت محتاج ہے جن سے وہ اپنی غلطیوں کا احساس کر سکے اور اپنی اصلاح کر سکے۔
- اساتذہ کو چاہیے کہ وہ نوجوان طلبہ کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انھیں اپنی خود اعتمادی دوبارہ حاصل کرنے کے گر بتائیں۔ اس کے لیے اساتذہ کو بھی پڑھاتے وقت خود اعتمادی سے پُر ہونا چاہیے اور تعلیم میں پچھڑ جانے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔
- مذہب ہندستانی تہذیب کی روح ہے، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ ہم بہت حد تک مذہب کو اپنے تمام طلبہ کے ذہن میں بٹھا سکتے ہیں اور ملک میں پھیلی ہوئی برائیوں پر بہت حد تک روک لگانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کے سامنے مذہب کی توضیح ضبطِ نفس، بے لوث خدمت، بندگی، محبت اور ایک دوسرے کی سچی مدد سے کرنی چاہیے اور انھیں باور کرانا چاہیے کہ مذہب کردار کو بلند کرنے کا ایک کار آمد ذریعہ ہے۔ طلبہ کو بتانا چاہیے کہ دنیا کے تمام مذاہب بنیادی طور پر کیسے یکساں اور متحد ہیں تاکہ ان کے ذہن میں ایک قسم کی رواداری پیدا ہو سکے۔ ہمیں طلبہ کو بتانا چاہیے کہ تمام مذاہب کس طرح آپس میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں تاکہ ہمارے ملک کے اتحاد کا تانا بانا مزید مضبوط ہو سکے۔ اس سلسلے میں پائیدار منصوبے کے ساتھ سیاسی عزم زیادہ اہم اور کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔
- اعلا تعلیم میں صرف نمبر ہی کو معیار نہیں بنانا چاہیے بلکہ کچھ بنیادی اقدار کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس موقعے پر دانشوروں کو چاہیے کہ وہ نظامِ تعلیم کو ایک بار پھر منظم اور بار آور بنانے کے لیے اپنی خدمات پیش کریں تاکہ تعلیم (Acadmics) کے مستقبل کو روشن بنایا جا سکے۔

□□□

مترجم کا پتہ:
42, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi-67

تحریر: جنگ تھیوڈوروکاس سنگھ
ترجمہ: کلیم اللہ

زبانوں کے بڑھتے ہوئے قبرستان

دنیا شور و غوغا کے ساتھ نہیں، سرگوشی کے انداز میں ختم ہوتی ہے، ایک دم توڑتی ہوئی سرگوشی کے ساتھ۔ "نیچر" میگزین کے حالیہ شمارے کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کی جن 6800 زبانوں کی فہرست سازی کی گئی تھی، ان میں سے 471 زبانیں ختم ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ برطانوی ماہر ماحولیات ولیم سدرلینڈ (William Sytherland) نے، جنھوں نے یہ مطالعہ کیا ہے، انکشاف کیا کہ 46 زبانیں ایسی ہیں جن کا محض ایک ایک ہی بولنے والا موجود ہے۔ جب وہ 46 افراد مر جائیں گے تو 46 مختلف زبانیں جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، ان کے ساتھ مر جائیں گی۔

سدرلینڈ نے نامبیا کی ایک عورت کی دلدوز کہانی بیان کی ہے جس کا خیال تھا کہ وہ اپنی مقامی زبان کی بولنے والی واحد زندہ خاتون ہے۔ لیکن محققین نے یہ زبان بولنے والے ایک اور شخص کو بھی ڈھونڈھ نکالا۔ ایک ریڈیو رابطے کا انتظام کیا گیا تاکہ اس زبان کے محض دو بولنے والے ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں۔ ان میں ہر ایک کی کھوج درحقیقت رابنسن کروسو کی کھوج کی طرح اہم ہے۔ اس لسانی ریگستان نما جزیرے میں ایسے افراد یکہ و تنہا نہیں ہوں گے بلکہ اس لسانی ریگستانی جزیرے کی ریت میں بہتوں کے پیروں کے نشانات ہو سکتے ہیں۔

دوسری تقریباً مٹ جانے والی زبانوں میں سے ایک بنگ (Bung) ہے جس کو کیمرون میں تین لوگ بولتے ہیں اور دوسری اباگا (Abaga) ہے جس کے پاپوا نیو گینیا میں پانچ بولنے والے ہیں۔ ایک دوسرے ماہر لسانیات انتھونی ٹریل نے 30 کھوسین بولیوں کی نشاندہی کی ہے جنھیں افریقہ کے قدیم باشندے (Bushmen) بولتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بولیاں حروف علت (Vowels) یا حروف صحیح (Consonants) کی آوازوں کے بغیر ٹک ٹک کرنے والی آوازوں کے سلسلے پر مشتمل ہیں۔ جس طرح بہت سے ماہرین ماحولیات نے حیوانات اور نباتات کے سرے سے ختم ہو جانے کے سبب ہونے والے ناقابل تلافی نقصانات سے متنبہ کیا ہے اس طرح زبانوں کی اموات کی طرف توجہ نہیں دی گئی جو کہ اس کی مستحق ہیں۔

ایک سوشل ڈارون وادی یہ کہہ سکتا ہے کہ زبان محض ترسیل و ابلاغ کا ایک ذریعہ ہے اور یہ کوئی مقدس چیز نہیں۔ کسی دوسری کرنسی کی طرح جو اب استعمال میں نہیں کیوں کہ اس کی جگہ ایک بہتر اور زیادہ قابل قبول کرنسی موجود ہے، غیر مروجہ زبانیں بھی بازار، فطرت کے قوانین کے تحت نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انھیں صرف ماہرین کے تہذیبی تجسس کی دلچسپی کے پیش نظر لسانی عجائب گھر میں رکھا جا سکتا ہے۔

لیکن اس طرح کے بجائے اصلح نظریے (servival of fittest) کے تحت اس بنیادی نکتے کو بھلا دیا جاتا ہے کہ زبان نہ صرف سماجی یا تہذیبی حقیقت کو منعکس کرتی ہے بلکہ اسے جنم بھی دیتی ہے۔ لہٰذا جب ایک زبان مرتی ہے تو اس کے ساتھ اس سے تعلق رکھنے والے بہت سے انسانی رسوم و رواجات، اور عادات و خصائل بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اینوت (Envit) کی اسکیمو زبان میں مختلف قسم کی برف کے لیے گیارہ الگ الگ طرح کے الفاظ ہیں لیکن رومانی اور انفرادی محبت کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اینوت زبان بولنے والے محبت کے نااہل ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کا سماجی ڈھانچہ جماعتی رشتے کے بندھن پر منحصر ہے جو کسی ایک قبائلی ممبر کو کسی دوسرے قبائلی ممبر سے مخصوص رشتے قائم کرنے کی ضرورت سے باز رکھتا ہے۔ خواہ وہ بچے اور بوڑھے ہی کیوں نہ ہوں جن کی مشترکہ طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

زبانیں ہماری دنیا نیز ہمارے باہمی ردِ عمل کا تانا بانا تیار کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی پروپیگنڈا کرنے والوں نے زبان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے۔ لسانی فوقیت پرستی (Linguistic Chauvinism) اسرائیل کی توسیع میں مدد کرنے کے لیے ہبرو کے فروغ سے لے کر ہندی کو سنسکرت زدہ اور اس کو مبینہ غیر ملکی عناصر جیسے اردو الفاظ سے پاک کرنے کی کوششوں تک میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔

شاید بازار کی سب سے زیادہ جارحانہ زبان انگریزی ہو چکی ہے۔ بہت سی مقامی زبانوں کو تو بھول ہی جائیے جن کو اس نے خاموش کر دیا ہے، اس نے ترقی یافتہ معاشرے کی بہت سی زبانوں مثلاً فرانسیسی کو بھی اینگلو فوبیا کے تئیں مدافعانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ فرانسیسی انگریزی جملے جیسے

لی ویکینڈ (Le weekend) اور لی بفس ٹیک (Le bifstek) کے خلاف فرنچ اکادمی نا قابلِ فتح جنگ لڑ رہی ہے۔ انگریزی بولنے والوں اور لکھنے والوں نے بھی الفاظ کی حد سے زیادہ اجارہ داری کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ جب لاطینی زبان کو ایک مردہ زبان قرار دے کر برطانوی پبلک اسکولوں سے ختم کیے جانے کی کوشش کی گئی تو بلی بنٹر (Billy Bunter) کے خالق فرینک رچرڈس نے اپنا اگلا مسودہ ہورلیس (Horace) اور ورجل (Virgil) کی زبان میں بھیجا۔ اس نکتے پر غور و خوض کیا گیا۔ لہٰذا لاطینی زبان کو ہنر کی برافروختگی کی وجہ سے برطانوی پبلک اسکولوں میں برقرار رکھا گیا۔

انگریزی کی بالادستی کم و بیش ہر جگہ قائم ہے۔ تاہم اس کی عین کامیابی ایک دن اس کے تنزل کا سبب ثابت ہو سکتی ہے۔ اس زبان کا بہت سی زبانوں کے ساتھ اس قدر میل ملاپ ہے کہ اس نے مختلف ممالک میں جدا جدا رنگ کی زبانوں کو جنم دیا ہے۔ خود ہماری ہندستانی انگریزی یا جمائکن انگریزی کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ جب شہزادہ فلپ نے ٹونگا میں منعقد ایک عوامی جلسے سے خطاب کیا تو انھوں نے بلا جھجک مقامی انگریزی چینی زبان (Pidgin) میں اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے Fella belongs to Mrs. Queen کے بجائے Fella belong Mrs Queen کا استعمال کیا۔

کیا تندوری پیزا (Tandoori Pizza) اور شاکاہاری بگ میک (Shakahari Big mac) کے مفہومیاتی متبادل کا مظہر (Phenomenon) ہماری بتدریج یکسانیت پذیر دنیا کو مالا مال یا مفلس بنا سکتا ہے؟ کیا اس نوع کی لسانی مقامیت اور عالمگیریت (Glocalisation) ہی سٹیلائٹ ٹیلی ویژن اور نیٹ کی عالم کاری کی تیز رو لہروں کے خلاف ہمارا واحد دفاع ہے؟

زبانوں کے وسیع ہوتے قبرستان شاید جوابوں سے زیادہ سوالوں کا پتہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ٹرائل (Trial) نے رائے زنی کی ہے کہ مردہ یا مرتی زبانوں کے بولنے والے زیادہ ترذولسانی ہیں۔ ان لوگوں کی زبانیں جو سکڑ رہی ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک وہ خاص اہمیت کی حامل نہ ہوں کیوں کہ وہ اپنے نئے ماحول کی زبان کو اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کے بدلتے ہوئے محلِ وقوع، سماجی رسم و رواج، خورد و نوش کی عادتیں، خاندانی بندھن اور روحانی ایقان کا تجزیہ کر کے زبان کے ختم ہونے اور دوبارہ پیدا ہونے کے تمام اثرات کا ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔

مستقبل کی بے خوف نئی دنیا میں جو چیز بولی جانے کی منتظر ہے، اس سے ایک بات واضح ہے کہ شروع کی طرح آخر میں بھی وہ لفظ ہی ہے اور شاید اب لفظ کا اظہار مختصر پیغام رسانی سروس (Short massaging service) کی شکل میں ہو۔

نوٹ: عصر حاضر کے ممتاز اردو شاعر جناب مخمور سعیدی کی ایک نظم "لفظوں کا المیہ" میں اس پوری صورتِ حال کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ یہ نظم تیس سال قبل لکھی گئی تھی اور ان کے دوسرے مجموعہ کلام "سیہ بر سفید" (1973) میں شامل ہے۔

نئے نئے لفظ، شور کرتے
بڑھے چلے آ رہے ہیں۔
فکر و خیال کی رہگذار آباد ہو رہی ہے
زباں بہت سی پرانی حد بندیوں سے آزاد ہو رہی ہے
کئی فسانے جو اَن کہے تھے، کئی تصور جو بے زباں تھے
ہزار عالم نشاط و غم کے جو پہلے نا قابلِ بیاں تھے
وہ دھڑکنیں، خامشی ہی جن کے خروشِ پنہاں کی ترجماں تھی
وہ نغمگی جو خموشیوں کے سیاہ زنداں میں پرفشاں تھی
اسے اب آخر کھلی فضاؤں میں اِذنِ پرواز مل گیا ہے
کہ اک نیا رشتہ درمیانِ خیال و آواز مل گیا ہے!
مگر مجھے چپ سی لگ گئی ہے
نئے نئے لفظ شور کرتے بڑھے چلے آ رہے ہیں
—اور میں

ہجومِ پر شور میں، اکیلا
پرانے لفظوں کو ڈھونڈتا ہوں
یہ دیکھتا ہوں
جہاں جہاں کل پرانے لفظوں نے ڈال رکھے تھے اپنے ڈیرے
وہاں نئے لفظ آ کے آباد ہو گئے ہیں
مکاں اگرچہ اُجڑ نہ پائے، مکین برباد ہو گئے ہیں

نئے نئے لفظ شور کرتے بڑھے چلے آ رہے ہیں
— لیکن
پرانے لفظوں کی پائمالی نے دم بخود کر دیا ہے مجھ کو
کسی نے سوچا نہیں ہے شاید مگر میں اکثر یہ سوچتا ہوں
— پرانے لفظوں کے ساتھ ہی اک پرانی دنیا بھی کھو گئی ہے
خموشیوں کے سیاہ زنداں میں جا کے روپوش ہو گئی ہے۔

(بشکریہ "ٹائمس آف انڈیا" 10 / جولائی 2003)

□□□

NCPUL, West Block-1, R.K. Puram,
New Delhi-110 066

ابوالکلام

مشاعروں کی سماجی معنویت

مشاعروں کی تحریک شاعروں کے اس جذبے سے ہوئی ہے کہ لوگ ان کے کلام کو سنیں اور ان کی تخلیقی کاوشوں کو سراہیں۔ قوی امکان ہے کہ ایسی ادبی نشستیں شروع میں نجی رہی ہوں گی اور یہ نشستیں شعرا یا معاشرے کے بااثر اور باذوق اشخاص کے گھروں پر منعقد ہوتی رہی ہوں گی۔ قہوہ خانوں میں اور بازاروں کی خاص خاص دکانوں پر بھی ایسے اجتماعات کا پتہ چلتا ہے جہاں شعرا جمع ہو کر ایک دوسرے کو اپنا کلام سنایا کرتے تھے اور ایک طرح کا مسابقہ ہوتا رہتا تھا۔ کچھ ادبی نشستوں کا انعقاد شام کے وقت بیٹھکوں پر ہوتا رہتا تھا۔ ان سبھی کو ہم مشاعرے کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔

زمانۂ قدیم میں جب اجتماعی ترسیل و ابلاغ کے مناسب وسائل دستیاب نہیں تھے تو ادبی نشست یا مشاعرے کو ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ہندستان میں بھی ادبی نشستوں یا مشاعروں کا آغاز مسلمانوں کی آمد اور اردو کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہوا۔

عرب معاشرے میں اشعار پڑھنے اور سنانے کو انشاد اور نشید کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم گا کر سنانا ہوتا ہے۔ قدیم مجالسِ شعر میں شعرا اپنا کلام گا کر سنایا کرتے تھے۔ مشاعروں کا آغاز عرب و ایران میں چھوٹی چھوٹی نشستوں سے ہوا تھا جن کو بعد میں مشاعروں سے موسوم کیا گیا۔ عرب میں طائف کے نزدیک عکاظ کے مقام پر ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں عرب کے تقریباً تمام قبائل شریک ہوتے تھے اور ہر فن کے ماہر اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ دیگر تفریحات کے علاوہ یہ مقام شاعروں کے لیے اپنے علم و فن کے اظہار کا ایک اہم مرکز تھا جہاں عرب کے کونے کونے سے سخن گو اور سخن شناس جمع ہوتے تھے۔ اس میلے میں شاعر اپنا قصیدہ پیش کرتا تھا اور مجلس کا حَکم اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ اس برس کس کا قصیدہ سب سے بہتر رہا۔ جس قصیدے کو سب سے بہتر قرار دیا جاتا اسے سونے کے پانی سے حریر پر لکھ کر کعبے کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں سات قصیدہ نگاروں کے نام لیے جاتے ہیں جن میں امرء القیس سرِ فہرست ہے۔ جن قصیدوں کو یہ مرتبہ حاصل ہوا انھیں سبعہ معلقہ کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ بعد تک جاری رہا اور بنی اُمیہ اور بنی عباس کے دورِ خلافت میں شعرا گا کر ہی اشعار سنایا کرتے تھے۔ بعض خوش گلو شعرا نے درباروں میں بڑی مقبولیت اور عوام میں بڑی ہردلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ مثال کے طور پر الدارمی، حطیہ اور اسحاق موصلی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ چونکہ لحن میں بذاتِ خود قیامت کی اثر انگیزی ہوتی ہے اور شعرا کے نوکِ قلم اور زبان سے نکلا ہوا کلام مانند نوائے سروش ہوتا ہے اس لیے دونوں کے مناسب امتزاج سے پڑھے گئے اشعار سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری کرتے ہیں۔ اس اثرانگیزی سے معاشرے میں شعر اور مشاعروں کی افادیت و معنویت دوبالا ہو جاتی ہے۔ شاعر بادشاہ اور امرا کے سامنے اپنے قبیلے کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی شعری صلاحیتوں کے جوہر دکھاتا اور اس طرح قبیلے کے لیے مراعات حاصل کرتا۔ شاعر کو نہ صرف غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا بلکہ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر شاعر کے قبضے میں ایک جن ہوتا ہے جو اسے نفیس مضامین اور اعلا خیالات القا کرتا اور غیب کی باتیں بھی بتاتا ہے۔

صوفیائے کرام نے مشاعرہ و سماع اور قوالی وغیرہ کا سہارا لے کر ہندستانی معاشرے میں مذہبیت، رواداری اور مساوات کی تعلیم کو عوام میں پھیلایا نیز اردو زبان و شاعری کے فروغ میں ایک کلیدی رول ادا کیا جسے اردو زبان و ادب کا طالب علم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ شاہی سرپرستی میں شاعری کو بہت فروغ ہوا۔ یہاں تک کہ شاعر اور قصہ گو درباروں کا لازمی حصہ بن گئے۔ نتیجتاً کئی امرا اور بادشاہ خود شاعر بن گئے۔ مشاعرے دراصل ایک خاص سماجی نظام کی پیداوار ہیں۔ بادشاہوں، امرا، نوابوں اور رئیسوں نے جب مشاعروں کی سرپرستی کی تو اس کے پیچھے یہ خواہش بھی مضمر تھی کہ انھیں علم دوست اور ادب نواز سمجھا جائے۔ ہمارے زمانے میں مشاعرے اس لیے بھی اہمیت کے حامل ہو گئے ہیں کہ آج ان کا تعلق عوام سے ہے اور چونکہ موجودہ جمہوری نظام میں عوام کی اہمیت ہے اس لیے مشاعرے سیاست کاروں اور معاشرے کے بااثر و رسوخ اشخاص کے لیے ایک اہم تہذیبی اور افادیت کے حامل ادارے کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ دراصل طرزِ حکومت و معاشرے کی تبدیلی اور خواندگی و تعلیم کی شرح میں اضافے کے باعث مشاعروں کے جمہوریانے یعنی Democratization کے عمل کی طرف واضح اشارہ ہے۔ درباروں اور سلاطین کے دور کے خاتمے، طرزِ معاشرت و نظام کے بدلنے اور جمہوریت کے آنے سے مشاعرے جو ادبی نشستوں کی شکل میں منعقد ہوتے تھے دیگر اداروں کی طرح عوامی رنگ اختیار کر گئے۔ دراصل یہ طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت کی تبدیلی کا اشاریہ

ہے۔ یہ ارتقائی عمل مشاعروں کی مقبولیت میں معاون ثابت ہوا۔ مشاعروں میں نشست و برخاست اور تعریف و تعریض کے بھی آداب ہوتے تھے۔ بالخصوص امرا کے مشاعروں میں اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے شعرا اور مشاعروں کی تعداد بڑھنے لگی اور سامعین کی صفیں بدلتی گئیں ویسے ہی ویسے مشاعروں کا ادبی اور روایتی معیار بھی مختلف ہوتا گیا۔

محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے ایما پر لاہور میں ایک ایسی انجمن کی بنیاد ڈالی جس کے زیرِ اہتمام مقصدی اور نظمیہ مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں بجائے مصرعِ طرح کے نظم کا عنوان دیا جاتا تھا جیسے امید اور حبِ وطن وغیرہ۔ حالی بھی آزاد کی ان کوششوں میں شریکِ کار تھے۔ حالی نے خصوصاً حب الوطنی اور قوم پرستی پر بڑی جامع اور پُر اثر نظمیں لکھیں۔ اسی طرح سے دیگر شعرا نے بھی ان مشاعروں میں قومی مسائل اور حب الوطنی کے جذبات کا بیان اپنے اپنے انداز سے کیا۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کا مقصد موضوعاتی اور وطنی شاعری کا فروغ تھا۔

یہ مشاعرے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مشاعروں میں کافی دنوں تک شعرا اپنا کلام تحت اللفظ سنایا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ بعض شعرا اپنا کلام لحن سے سنانے لگے۔

انجمنِ پنجاب اور ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر مشاعرہ غزلوں سے آگے جا چکا تھا۔ اب گیتوں اور معیاری انقلابی اور طنزیہ و مزاحیہ نظموں سے بھی مشاعرے لوٹے جاتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر مشاعرے بنیادی طور پر نظموں کے مشاعرے ہوتے جا رہے تھے۔ ان نظموں میں وہ قومی جوش اور انقلابی ولولہ ہوتا تھا جو نوجوانوں کو مسحور کر لیتا تھا۔ مشاعروں کی حد تک ترقی پسندی کا دور مختصر ہی رہا اور آزادی کے بعد محرکات بدل گئے اور رفتہ رفتہ وہ صورتِ حال بھی بدلنے لگی۔ آہستہ آہستہ غزل کے احیا اور نظموں کی پسپائی کا دور شروع ہو گیا۔ اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ مشاعرے ہمارے قومی عزائم کے آئینہ دار بن گئے۔ آزادی اور انقلاب کا پیغام عوام و خواص تک پہنچانے میں ان کا اہم کردار رہا۔ اس دور کے مشاعروں نے سماجی مسائل سے متوسط طبقے کو باخبر کیا۔ مشاعروں نے ترقی پسندی کے ایک ایسے پلیٹ فارم کے طور پر کام کیا جہاں نو آموز اور استاد شعرا بغیر کسی تکلف اور تفریق کے اکٹھا ہوتے تھے۔ جنگِ آزادی کے دوران مشاعروں نے ہندستانی معاشرے کی عدم مساوات کو دور کرنے کے لیے حربے کے طور پر بھی کام کیا۔

مقصدی مشاعرے کی ایک بہت اہم مثال انڈین نیشنل کانگریس کا انچاسواں (49) اجلاس ہے جو 1936 میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ آنند نرائن ملا صدرِ مجلسِ استقبالیہ تھے اور مشاعرے کی صدارت محترمہ سروجنی نائڈو نے کی تھی۔ ملا نے اپنے استقبالیہ خطبے میں کہا تھا۔

"مشاعرے کا اعلاترین منصب قوم اور ملک کی بیداری ہے"(۱)

اس مشاعرے میں اہم شعرا نے قومی نظمیں اور کچھ غزلیں بھی سنائیں جو جذبۂ حب الوطنی سے پُر تھیں۔

ہندستان زمانۂ قدیم سے مختلف مذہبوں، فرقوں، طبقوں اور علاقوں کے افراد کا مسکن رہا ہے اور یہ فخر بہت کم تہذیبوں اور ملکوں کو حاصل ہے۔ اس تہذیبی اور ثقافتی رنگا رنگی کی بہتر اور موثر عکاسی اردو زبان و ادب بالخصوص شاعری کے ذریعے ہوئی ہے۔ چوں کہ مشاعرہ اجتماعی حسیات کے موثر اظہار کا ذریعہ ہے اس لیے یہاں مشاعرے کا بہت اہم رول ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مشاعرے کی خاصیت یہ ہے کہ زبان کی سطح پر، موضوع و مواد کی سطح پر اور پیش کش کی سادگی کی سطح پر مذکورہ بالا پہلوؤں کی موثر اور دلکش عکاسی کرتا ہے۔

ہندستان کی قومی یک جہتی اس وقت تک فروغ نہیں پا سکتی جب تک مختلف فرقوں، طبقوں، مذہبوں اور علاقوں کے لوگ یکساں طور پر ملک کے ہمدرد و خیر خواہ نہ ہوں۔ دراصل جمہوریت اور قومی یک جہتی ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ جمہوری انداز میں قومی یک جہتی کا مظاہرہ عملاً ہم مشاعروں میں دیکھ سکتے ہیں کیوں کہ مشاعروں میں مختلف مذہبوں، طبقوں، فرقوں اور علاقوں کے شعرا اور سامعین کی شمولیت اور مختلف اصناف میں پڑھے گئے اشعار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ مشاعرہ ایک ایسا سماجی ادارہ ہے جو جمہوریت اور قومی یک جہتی کو تقویت بخشتا ہے۔ مشاعرے جیسے سماجی ادارے ملک میں ایسی خوش گوار اور قومی ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے عوام کا نہ صرف تزکیۂ نفس ہوتا ہے بلکہ امن و سکون سے رہنے کا رجحان بھی بڑھتا ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی قومی یکجہتی اور جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔

26/ جنوری 1950 کو جو دستور نافذ کیا گیا اس کی رو سے بھارتیوں کو حقِ مساوات، حقِ آزادی، استحصال کے خلاف آواز اٹھانے اور اس سے حفاظت کا حق، مذہبی آزادی کا حق، سماجی اداروں کی تشکیل کا حق، تعلیمی اور ثقافتی حق جیسے کچھ بنیادی حقوق، ان کی قوت و صلاحیت کو نکھارنے اور ترقی کے یکساں مواقع و ماحول فراہم کرنے کی خاطر دیے گئے ہیں۔ مشاعرے نہ صرف مذکورہ بالا حقوق کے عکاس ہیں بلکہ عوام میں عملاً ان کی ترویج و اشاعت کرتے ہیں۔ شعرا ظلم اور استحصال کے خلاف اور مساوات کے حق میں اپنے اشعار میں آواز بلند کرتے ہیں۔ اپنے انقلابی خیالات و افکار

براہ راست عوام تک پہنچا کر حریت اور رواداری کی سطح پر شعوری و لاشعوری تربیت کرتے ہیں۔ مشاعروں میں پڑھے گئے کلام سے عوام کی سماجی حسیت کو جلا اور استحصال اور عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب ملتی ہے۔

یوم جمہوریہ اور یوم آزادی جیسے موقعوں پر منعقد مشاعروں میں شریک عوام اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اردو شاعری کی مقبولیت اور عوامی جذبات سے مشاعروں کی ہم آہنگی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن ان نئے رجحانات سے مشاعروں کی ہیئت اور ماہیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ پہلے کے مجمعوں کے مقابلے میں آج کے مجمعے مشاعروں کی روایتوں ہی سے نہیں بلکہ ادبی اور لسانی روایتوں سے بھی کم آشنا ہیں۔ پہلے کے مشاعرے ایک خاص جاگیر دارانہ ماحول کے پروردہ تھے۔ اب عوامی عنصر بڑھ گیا ہے اور اس عنصر کی ترتیب میں ایسے افراد کہیں زیادہ ہیں جو ادبی ذوق کی تسکین سے زیادہ تفریح طبع کے خیال سے مشاعروں میں آنے لگے ہیں۔

گاندھی جی ایک ایسے سماج کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جس میں مذہب وملت، رنگ و نسل اور ذات پات کی تفریق نہ ہو۔ ہر مذہب اور رنگ و نسل کے لوگوں کو یکساں تحفظ اور انصاف حاصل ہو تاکہ صحیح معنوں میں ہمارے معاشرے میں جمہوریت پر مبنی قومی یک جہتی پھل پھول سکے۔ قومی یکجہتی کے لیے نظم وضبط بھی بہت ضروری ہے۔ لیکن آج ہمارے ملک میں بد نظمی اور انتشار کا دور دورہ ہے۔ اندرونی اور بیرونی دشمن عناصر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جس کی وجہ سے ملک کی سالمیت اور بقا کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ مزید برآں المیہ یہ ہے کہ معاشرہ بے حسی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں مشاعروں جیسے اداروں اور شعرا جیسے حساس اشخاص کی اہمیت دوگنی ہو جاتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر ملک و تہذیب کے شعرا نے اپنے معاشرے کو Sensitize اور Sanitize کرنے کے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس لیے ان کو آج بھی اپنی اس مضمر قوت کو بروئے کار لا کر معاشرے کو درکار روشنی دینی چاہیے۔

قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے نیز مزید تقویت دینے کے لیے فکری، تعلیمی اور سماجی بیداری اشد ضروری ہے۔ قومی اور اقداری لوعیت کی تعلیم ہی سے قومی کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ تعلیم ہی ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جس کی مدد سے ذہنی رجحان میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور وسیع الخیالی کی نشو ونما ہو سکتی ہے۔ اس طرح لوگوں میں انسانیت پر مبنی مساوات کا جذبہ اور قومی یکجہتی کا شعور بیدار ہوگا۔ چوں کہ مشاعرے لاشعوری اور غیر رسمی طور سے سامعین کو مذہبی رواداری، وسیع القلبی اور وسیع النظری جیسی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں اس لیے ان کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرتے ہوئے ان کے انعقاد کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

مشاعروں نے بیک وقت ادب اور ثقافت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے اور زبان و ادب کے فروغ کے لیے شاعروں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت وقیع اور قابل قدر ہیں۔ اہمیت وافادیت کے پیش نظر انھیں اہم سماجی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ اردو کی واحد ادبی روایت ہے جس نے زبان و ادب اور ثقافت کے فروغ میں عوامی سطح پر اہم کردار ادا کیا ہے اور اردو زبان و ادب کو عوام سے قریب تر کیا ہے۔ علاوہ ازیں تخلیق کار (شاعر) اور قاری (ناظر و سامع) کے درمیان ایک براہ راست اور مستحکم رشتہ یہیں نظر آتا ہے۔ مشاعروں سے لطف اندوزی ہی مقصود نہیں تھی بلکہ سامعین کو بصیرت و عرفان بہم پہنچانا تھا۔ علاوہ ازیں لطف و انبساط کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی سطح پر اصلاح بھی ایک مقصد تھا۔ اساتذۂ فن نے زبان کی معیار بندی کی اور مضامین میں جدت اور ندرت خیال کی راہ ہموار کی۔ مشاعرے نو آموز اور نو مشق شعرا کے لیے تربیت گاہ تھے۔ عوام میں اردو زبان کی مقبولیت انھی مشاعروں کے سبب ہوئی۔ اس کے علاوہ مشاعروں نے مشترکہ تہذیب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں کیوں کہ ان محفلوں میں بغیر کسی تفریق کے ہر طبقے اور مذہب کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مشاعروں کے ذریعے اردو زبان صاف، سلیس اور شیریں ہوئی ہے۔ مشاعرے اردو زبان و ادب بالخصوص شاعری کی شیرینی کو عوام تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔

مشاعروں کی ایک معنویت یہ بھی ہے کہ ان کی ابتدا اور ارتقا کے مطالعے سے نہ صرف اردو زبان و ادب اور ثقافت بلکہ سماج کی تاریخ کے لیے مواد مہیا ہو سکتا ہے۔ چوں کہ مشاعرے تخلیق اور تنقید کے متوازی عمل کے محور اور گہوارہ ہوتے ہیں اس لیے مشاعرے یا ادبی نشستیں اردو شاعری اور تنقید کی تاریخ کے لیے ایک بہت اہم مواد کے مانند ہیں۔ مشاعروں میں شریک ناظرین و سامعین اور اسٹیج پر موجود شعرا کا اشعار کے تئیں ردِ عمل ان کے ذوق جمال کا اظہار ہے جس کو تاثراتی اور فنی و اسلوبیاتی تنقید کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ شعرائے اردو کے تذکرے مذکورہ خصوصیات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس طرح اردو شاعری و تنقید کی تاریخ مرتب کرتے وقت مشاعروں کو اہمیت دینا ناگزیر ہے۔

مشاعرے فلاحی، اصلاحی اور تعلیمی مشن سے جڑے اداروں کے تعلیمی اور ثقافتی ماحول کو نہ صرف صحت بخشتے ہیں بلکہ ان کو درپیش مالی مسائل کو حل کرنے میں بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مشاعرے کے منتظمین فنڈ اکٹھا کر کے اداروں کے مذکورہ مشن کی حصولیابی کے لیے مالی سہولت فراہم

کرتے ہیں جس سے اداروں میں تعلیمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری و ساری رہتی ہیں۔

مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلوں، نظموں اور گیتوں کی سادہ زبان اور پیش کش کو صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو گاندھی جی کے ہندستانی زبان کے تصور کو عملاً فروغ ملتا ہے۔ ہندستان جیسے ملک میں عوام کے اس بڑے طبقے کے لیے، جس کی رسائی کتب و رسائل تک نہیں ہے اور جس کے پاس مالی وسائل کم ہیں، مشاعرہ تفریح و تربیت کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔

مشاعرے محض تفننِ طبع کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ زبان کی نوک پلک درست کرنے کے پلیٹ فارم کے طور پر کام کرتے ہیں اور زبان و بیان کے نت نئے طریقوں سے متعارف کراتے ہیں۔ اظہار کا سلیقہ اور زبان میں زور پیدا کرنے کا ہنر شعرا حضرات اسی ادارے سے سیکھتے ہیں۔ بیان اور اظہار کی سطحوں پر مشاعروں نے زبان کو جس طرح آگے بڑھایا ہے، اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ مشاعروں کی بدولت عوام میں شعر فہمی کی صلاحیت کو جلا ملی اور اشعار کے حوالے سے زبان کی جو نزاکتیں اور لطافتیں تھیں، عوام کی عام بول چال کی گفتگو کا جزو لاینفک بنتی گئیں جس کے سبب اردو زبان عوامی سطح پر بھی معیاری بن کر ابھرنے لگی۔ اس طرح مشاعروں نے زبان و بیان کی معیار بندی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مشاعروں کی لسانی، تخلیقی، تہذیبی اور تعلیمی تاریخ رہی ہے۔ اہلِ ذوق شعرا سے نشست و برخاست، آداب و اخلاق اور تہذیب سیکھتے ہیں۔ دوسری طرف شعرا بھی کچھ علمی اور فنی استفادہ کرتے ہیں کیوں کہ وہ ایک دوسرے کا کلام سنتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس شاعر نے کون سا قافیہ کس انداز سے نظم کیا ہے اور کون سا مضمون کس طرح باندھا ہے۔ بحر و وزن کا کیا التزام رکھا ہے، اس کے ہاں تغزل کا کیا رنگ ہے۔ ایک شاعر کے کلام کو دیگر شعرا دیکھتے سنتے اور تشریح و تفسیر کرتے ہیں۔

آج اردو کی مقبولیت کی بڑی علامت مشاعرہ ہے اور بعض حلقوں میں تو مشاعروں کے بغیر اردو کا تصور ادھورا ہے۔ مشاعروں کے ذریعے غیر اردو داں لوگ نہ صرف اردو سے متعارف ہوئے اور اردو سیکھنے کی طرف راغب ہوئے بلکہ ان میں اردو شعر و ادب کا ذوق بھی پیدا ہوا۔ غیر اردو داں لوگ مشاعرے سن کر دیوناگری رسم خط میں اردو شعرا کا کلام تلاش کرتے ہیں اور ان کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مزید برآں اب تو اس صورتِ حال میں مزید بہتری اس طرح آگئی ہے کہ مختلف اداروں اور جامعات کے ذریعے چلنے والے مراسلاتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے توسط سے اردو زبان و ادب کے شائقین بلا مذہب و ملت کی تفریق کے اردو رسم خط کو سیکھنے اور زبان و ادب سے براہ راست محظوظ ہونے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

مشاعرہ اردو حکائی روایت کی سب سے قدیم اور صحت مند روایت ہے اور تمام حکائی روایات میں مشاعرہ ہی ایسی روایت بن سکا ہے جو آج تک نہ صرف قائم و دائم ہے بلکہ اردو زبان و ادب اور ثقافت کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ حکائی روایت کے تمام مظاہر یعنی داستان گوئی، قوالی، بارہ ماسہ، چار بیت، مرثیہ خوانی، غزل گائیکی، مجرے، مسالے اور مولود خوانی وغیرہ میں مشاعرہ آج بھی مقبول ترین اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنی نوعیت میں تبدیلی کے باوصف عروج کی طرف مائل ہے، باقی ادبی و سماجی اداروں کا ذکر تو کتابوں میں ملتا ہے لیکن وہ عملاً معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مشاعرے میں وقت کا ساتھ دینے کی قوت و صلاحیت ہے، شاید اسی لیے یہ سماجی ادارہ معاشرے کی تاریخ کے نشیب و فراز کی عکاسی کرنے میں بھی کامیاب ہے۔

دورِ جدید میں مشاعروں نے خصوصاً فلموں میں شاعروں کی شمولیت نے غزل الیم کی روایت کو جنم دیا اور یہ چلن کافی مقبول ہو رہا ہے۔ مشاعروں میں غزلوں، نظموں اور گیتوں کو لحن سے پڑھنا بھی اس کی مقبولیت میں کار فرما ایک اہم عنصر ہے۔ کلام کے علاوہ انداز پیش کش، لفظوں کی ادائیگی، صوتی آہنگ، ہاتھوں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی مشاعرے کے شعرا اپنے کلام کو سامعین اور ناظرین تک موثر طریقے سے پہنچانے اور ان کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اشعار کو صحیح طریقے سے پڑھنا ایک فن ہے۔ اشعار کے معانی اور مطالب پر اسی وقت قاری یا سامع غور کرے گا جب کسی نہ کسی طرح شعر اس پر اثر انداز ہو رہا ہوگا۔ شعر فہمی کے لیے شعر کو صحیح قرأت سے پڑھنا ضروری ہے۔ شعر کی قرأت اور لہجے کے نشیب و فراز سے بھی معانی و مطالب اور مفاہیم نکالنے میں مدد ملتی ہے۔ مشاعروں میں شعرا اپنا کلام جس انداز سے پڑھتے ہیں اس سے سامعین کی قوتِ شعر فہمی میں اضافہ ہوتا ہے اور شعر کی نہ صرف اہمیت و افادیت اجاگر ہوتی ہے بلکہ اس سے بحیثیت مجموعی مشاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

نشر و اشاعت کی تمام تر سہولتوں کے فروغ کے باوجود روایتی مشاعرے کی اہمیت اسی طرح برقرار ہے کیوں کہ اس میں شاعر اور سامع کے درمیان براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ اسی اہمیت کے احساس کا ثمرہ ہے کہ مشاعرے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی حدوں میں بھی داخل ہو کر عوام کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں شاعر سامعین کے ردِ عمل سے محروم رہتا ہے جبکہ عوامی مشاعرے میں

سامعین کا ردِ عمل شاعر کو اپنے شعر کے حسن و قبح کی طرف توجہ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کے چلن کی بدولت مشاعرے اپنی افادیت اور معنویت کو ملک کے دور دراز علاقوں تک عوام کے درمیان پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مشترکہ ہندی اور اردو مشاعرے نشر ہوتے ہیں جو دو متنازعہ لسانی گروہوں میں لسانی ہم آہنگی کے بہت اہم سماجی ادارے کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ آج بھی عوامی مشاعروں اور یوم آزادی یا یوم جمہوریہ کے موقعوں پر منعقد مشاعروں میں مختلف فرقوں کے شعرا کے علاوہ ہندی کے بھی شعرا حصہ لیتے ہیں جس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خیر سگالی کو فروغ ملتا ہے۔

مشاعرہ تنقید کی ابتدائی منزل بھی ہے۔ دراصل جب شاعر اپنا کلام پیش کرتا ہے اور سامع اس سے اثر قبول کرتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے واہ نکل پڑتی ہے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ یا اسی طرح کے فقرے اس بات کی دلیل ہیں کہ سامع نے اس شعر کو پسند کیا اور کبھی سامعین سکوت اختیار کرتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ یا تو شعر سامع نے پسند نہیں کیا یا وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہر کیف تاثراتی تنقید ہی سہی لیکن تنقید کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے۔

مشاعروں کی ایک معنویت یہ بھی ہے کہ مبتدی شعرا اپنے آپ کو یا استاد شعرا اپنے شاگرد شعرا کو مشاعروں سے ہی لانچ (Launch) کرتے ہیں۔ اس کے بعد مبتدی شعرا سامعین و ناظرین کی حوصلہ افزائی اور اپنی صلاحیت کے بل پر آگے کے شعری سفر پر چل پڑتے ہیں مثلاً علامہ اقبال جیسے شاعر بھی انجمن پنجاب کے زیر اہتمام عوام کے سامنے آئے اور نہ صرف عوام سے متعارف ہوئے بلکہ نالۂ یتیم اور تصویرِ درد جیسی نظمیں بھی انھوں نے اسی انجمن کے جلسوں کے لیے لکھیں۔ کسی مشاعرے میں اپنا درج ذیل شعر پڑھ کر بڑی واہ واہ بٹوری اور بعد میں بہت ہی معیاری اور تاریخ ساز شعری سفر پر نکل پڑے۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

مشاعروں نے شعرا کی ذہنی نشو و نما میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ شعرا کو یہ محسوس ہوا کہ مبہم اور غیر واضح خیالات سے عوام کے ذہنوں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ بات عام فہم انداز میں کہی جائے جس سے عوام کا دل جیتا جا سکے اور خود شاعر کی شعری عظمت کا اظہار بھی ہو سکے۔ فن کی باریکیوں اور لطافتوں کے ذریعے عوام کو اردو زبان و ادب کی طرف متوجہ کرنے اور ان کے ذہن کو متاثر کرنے میں مشاعرے اہم رول ادا کرتے آئے ہیں۔ مشاعروں نے اردو زبان کو ترسیل و ابلاغ کے فن سے مزین کیا ہے۔ اس طرح اردو زبان کو عوام کی پسندیدہ زبان بنایا ہے۔

آج کا تیز رفتار دور عوامی ذرائع ترسیل و ابلاغ کا دور ہے جس میں صرف ادب کے قارئین ہی نہیں بلکہ ان سے زیادہ سامعین اور ناظرین ہیں۔ ادب کی اعلا قدروں کو مجروح کیے بغیر ان کی پسند کا خیال رکھنا ہوگا۔ ان میں شعور، ذوقِ جمال اور تخلیقی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی۔ مشاعرے کی شاعری میں عصری حسیت آفاقی تناظر میں پیش کی جانی چاہیے تاکہ سامعین کو اپنے مسائل کی جھلک دیکھنے کو ملے نیز انھیں عرفان بھی نصیب ہو۔

تقسیم ہند کے بعد بین الاقوامی مشاعرے ایک نئی سمت کا اشاریہ ہیں، مجری ادب کا اشاریہ۔ دراصل تقسیم ہند کے بعد اردو والے انقسام و انتشار کا شکار ہوئے۔ پھر وہ جہاں جہاں گئے وہاں وہاں اپنے ثقافتی لواروں کو بھی زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ انھی لواروں میں سے ایک لوارہ مشاعرہ بھی ہے۔ ہندو پاک مشاعرے بھی اسی انقسام کے نتیجے تھے۔ ان مشاعروں کے توسط سے سرحد کے دونوں طرف کے رجحانات اور حسیات کی نہ صرف ایک تصویر منظر عام پر آتی ہے بلکہ یہ شعرا کے لیے اتحاد اور امن و آشتی کے لیے ایک پلیٹ فارم کا کام بھی کرتے ہیں اور دونوں ملکوں کے عوام اور حکومتوں کے تعلقات کی بہتری اور بحالی کی خاطر Shuttle Diplomacy کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔

مشاعروں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اردو زبان و شاعری اور ثقافت کو قومی اور بین الاقوامی حیثیت دینے میں بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ برصغیر کے جغرافیائی بکھراؤ اور عالم کاری کے پیشِ نظر اردو لسانی گروپ کے افراد بحالتِ مجبوری یا بہ تقاضائے ضرورت دنیا کے مختلف ملکوں کو ہجرت کر گئے ہیں۔ اردو بولنے والوں کے ملکوں ملکوں پھیل جانے سے یہ محبوب ادبی و سماجی اجتماع بھی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس عمل کے باعث عالمی افق پر اردو Diaspora اپنے سماجی اور ثقافتی اداروں کے ساتھ طلوع ہوا ہے جس کی وجہ سے آج مشاعروں کا انعقاد دنیا کے کونے کونے میں ہوتا ہے۔ اس طرح ان ممالک میں بسے اردو والوں کی متعدد ناسلجیائی کیفیات کی تسکین مشاعروں کے ذریعے ہوتی ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اسی طرز پر ہندی میں کوی سمّیلن اور پنجابی میں کوی دربار رواج پا چکے ہیں۔ جب تک شعرا انسانی جذبات و احساسات کو گرفت میں لا کر غزلوں، نظموں اور گیتوں کے ذریعے ان کا متنوع اظہار کرتے رہیں گے اس وقت تک مشاعروں کی افادی و لفریبی جاری رہے گی۔ □□□

NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram-110 066

محمد شاہد حسین

خبر نگاری

- کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خبر ہے جب کہ عام واقعہ خبر نہیں۔
(لارڈ نارتھ کلف)[1]

- کسی بھی ایسے واقعے کی پہلی اطلاع خبر کہلاتی ہے۔ جس سے اخبار پڑھنے والوں کو دل چسپی ہو۔ (ایرک. سی. ہاپ ووڈ)

- خبر ایسی اطلاع کی غیر متعصبانہ رپورٹ ہے جس میں کسی تازہ واقعے یا حادثے کا بیان ہو اور یہ بیان اخبار کے قارئین کی دل چسپی کا سامان مہیا کرتا ہو۔ (ولیم. ایس. مابی)[2]

احمد نسیم سندیلوی نے ایسی بہت سی تعریفوں کو یکجا کر کے ایک عام اور جامع تعریف اس طرح مرتب کی ہے۔

"خبر کسی ایسے واقعے کا بیان ہے جو نیا ہو، عمومی دل چسپی کا باعث ہو، تازہ ہو، پہلے سے کسی کو معلوم نہ ہو، جو متحیر کرے۔ جس میں کاملیت ہو تاکہ پڑھنے والا تشنہ نہ رہے۔ بیان میں عصبیت نہ ہو۔ جو اخبار یا جریدے میں شائع کرنے کے قابل ہو اور جس کی اشاعت سے کسی کی تضحیک یا تذلیل نہ ہوتی ہو۔"[3]

خبر میں معروضیت لازمی ہے۔ یعنی خبر میں واقعہ کا بیان غیر جانب دار اور ذاتی تاثرات سے پاک ہونا چاہیے۔ تمام ذرائع ترسیل کی یہ ذمے داری مانی جاتی ہے کہ وہ خبروں کو بلا کم وکاست قارئین وسامعین تک پہنچائیں۔

خبر عوام کی ناگزیر ضرورت ہے یہ عوامی میراث سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اسے کسی فرد کی ملکیت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں کاپی رائٹ کا اطلاق خبروں کے بجائے خبر تحریر کرنے کے انداز پر ہوتا ہے۔

کون سی خبر اہم اور قابلِ اشاعت ہے اور اسے کتنی اہمیت دی جائے۔ یعنی اسے کس صفحے پر جگہ دی جائے۔ وہ ایک کالمی ہو، دو کالمی یا تین کالمی۔ اس کا انحصار مندرجہ ذیل باتوں پر ہوتا ہے۔

- خبر پڑھنے والے کون لوگ ہیں۔
- خبر میں کتنے لوگوں کی دل چسپی ہے۔
- خبر چھاپنے یا نشر کرنے والے کون لوگ ہیں۔
- خبر میں کتنے لوگ ملوث ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحافت مشن ہوا کرتی تھی لیکن اب یہ پیشہ ہے۔ آج عملی صحافت میں تجارت کا وہی اصول کار فرما ہے کہ کس چیز کی کیا مانگ ہے اور اس کی کیا قیمت مقرر کی جائے۔ بعض اخبارات اب بھی ایسے ہیں جو صحافت کو ایک مشن سمجھتے ہیں۔ لیکن اکثریت ایسے اخبارات کی ہے جو اسے تجارت کی طرح برتتے ہیں۔ اگر وہ چند اقدار کو اپنائے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے کہ ان کو اپنانے سے ان کی جنسِ فروخت کی مانگ بڑھے گی۔ لہٰذا آج خبر کی اہمیت اس نقطہ نظر سے ہوتی ہے کہ اسے پڑھنے یا سننے والے کون لوگ ہیں اور کتنے ہیں۔

مختلف اخبارات میں خبروں کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ جو خبر بڑے شہر کے اخبار کے لیے اہم ہے ضروری نہیں کہ وہ قصبے کے اخبار کے لیے بھی اہم ہو۔ انگریزی زبان کے اخبار کے لیے کوئی خبر اہم ہوگی تو علاقائی زبانوں کے اخبار کے لیے کوئی اور۔

ہر شخص کی اپنی پسند وناپسند ہوتی ہے۔ اس طرح بعض خبریں کچھ افراد کے لیے اہم ہوتی ہیں اور کچھ کے لیے نہیں۔ لیکن فرد کی طرح پسند وناپسند اکثریت کی بھی ہوتی ہے، لہٰذا خبر کی اہمیت کے حوالے میں اکثریت کی پسند و ناپسند بھی آجاتی ہے۔

خبر کو اہمیت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے عموماً مندرجہ ذیل جزئیات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔

- خبر میں کتنے لوگ دل چسپی لیں گے۔
- خبر سے کتنے لوگ متاثر ہوں گے۔
- خبر کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔
- خبر کی نوعیت کیا ہے۔ (بین الاقوامی، قومی یا مقامی)
- خبر میں انوکھا پن ہے یا عام سی خبر ہے۔
- خبر میں کتنی اہم شخصیت ملوث ہے۔
- خبر کتنی نئی ہے۔
- خبر میں کسی راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے یا کسی سازش کی نشاندہی کی گئی ہے۔[4]

خبر جتنے نزدیک کی ہوگی اتنی ہی دل چسپی سے پڑھی جائے گی اور جتنی تازہ ہوگی اتنی ہی اس کی اہمیت ہوگی۔ مختصر یہ کہ جو خبر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے، جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے احساسات میں کھلبلی پیدا کرے، جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بہلا کے پریشان کرے یا غور وفکر پر

آمادہ کرے اسے زیادہ اہم کہا جاسکتا ہے۔

خبریں تحریر کرنے کی کچھ خاص تکنیک ہوتی ہیں جن کے ذریعے خبر کو جاذب اور دل چسپ بنایا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر خبریں چار طریقوں سے لکھی جاتی ہیں۔

- الٹا اہرام۔
- خلاصہ۔
- معطل دل چسپی۔
- سلسلہ وار بیان۔

اہرام مصر کی شکل نکونی مخروطی ہوتی ہے۔ خبر تحریر کرنے میں الٹے اہرام سے مراد یہ ہے کہ ابتدا میں انتہا کو پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو اہم ترین بات ہوتی ہے وہ سب سے پہلے درج کی جاتی ہے۔ جیسے جیسے پیراگراف بڑھتے ہیں کم اہمیت والی بات مذکور ہوتی ہے۔ یعنی پہلے پیراگراف میں سب سے اہم اور ضروری بات، اس سے کم اہمیت والی بات دوسرے میں اور اس سے بھی کم اہمیت والی تیسرے پیراگراف میں۔ اسے اگر نقشے میں دکھایا جائے تو الٹے اہرام کی شکل بن جاتی ہے۔

اس طریقے میں ضروری نہیں ہوتا کہ خبر کی تفصیل سلسلہ وار بیان ہو۔ اس طریقۂ کار کو آج کل زیادہ تر اخبارات نے اپنا رکھا ہے۔ اس کی مقبولیت کی کئی وجہیں ہیں۔

- اس طریقۂ کار کو اپنا کر کوئی خبر مختصر بھی لکھی جاسکتی ہے اور طویل سے طویل بھی۔
- جو قاری عجلت میں ہے وہ دو چار لائنوں میں ہی خبر کی اہم اور خاص بات معلوم کرلے گا۔
- جس کے پاس وقت کی کمی نہیں، اس کے لیے پوری تفصیل بھی اس میں موجود ہوتی ہے۔
- اس میں سب ایڈیٹر کو سرخی جمانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اگر جگہ کی کمی ہو جائے تو آخری حصہ بآسانی حذف کیا جاسکتا ہے۔
- پوری خبر کا لب لباب بھی پہلے پیراگراف میں دیا جاسکتا ہے۔ جو معروف قاری کو آسانی سے مطمئن کردے۔

خبر تحریر کرنے کے دوسرے طریقے "خلاصہ" کو سمری (Summary) بھی کہتے ہیں۔ اس میں کسی خبر کا خلاصہ یا ماحصل مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ خبر سے متعلق دماغ میں آنے والے تمام سوالات کے جوابات فراہم ہو جائیں۔ کوئی بھی موضوع ہو۔ واقعہ عالمی نوعیت کا ہو یا ملکی، خلاصے میں ایسا انداز اختیار کیا جاتا ہے کہ قاری کو واقعات اور اس کے کوائف کا محیط جائزہ مل جائے۔ اس طریقۂ کار کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس میں خبر کو اچانک کہہ دینے کے بجائے مناسب پس منظر کے ساتھ کہنے کا موقعہ ملتا ہے جس سے اس کی اثر پذیری بڑھ جاتی ہے۔

خبریں تحریر کرنے کا تیسرا طریقۂ کار معطل دلچسپی ہے۔ بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر اہم بات ابتدا میں ہی بتادی جائے تو خبر میں دلچسپی ختم ہو جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رکھنے کے لیے اہم بات آخر میں دی جاتی ہے۔

چوتھے طریقۂ کار "سلسلہ وار بیان" کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ آج سب سے اہم بات کو سب سے پہلے بیان کرنے کا طریقہ مرغوب بھی ہے اور مفید بھی۔ لیکن کچھ حادثات و حالات کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ انھیں ٹھیک سے ذہن نشیں کرانے کے لیے تفصیلات سلسلہ وار ہی بیان کی جاتی ہیں۔ ہو بہو اسی ترتیب کے ساتھ جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ سید اقبال قادری لکھتے ہیں کہ:

> "یہ طریقۂ کار "سرگذشت نویسی" بھی کہا جاتا ہے۔ عموماً کسی اہم عدالتی مقدمے کے سلسلے میں شائع ہونے والی تفصیلات میں یہ طریقہ بہتر سمجھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی پارلیمانی روداد کی اشاعت میں بھی اس انداز بیان کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔"(5)

خبر کا ابتدائیہ:

بنیادی طور پر خبر کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ابتدائیہ اور متن۔ خبر کا پہلا جملہ یا ابتدائی چند جملوں کا مجموعہ ابتدائیہ کہلاتا ہے۔ سید اقبال قادری کا خیال ہے کہ:

> "ابتدائیہ لکھنے میں کمال حاصل کرنا صحافتی استعداد کی معراج ہے۔ عمدہ ابتدائیہ نویسی کامیاب صحافت کی ضمانت ہے۔"(6)

ابتدائیہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں پوری خبر کا خلاصہ یا تعارف ہوتا ہے۔ اگر خبر مختصر ہو تو ابتدائیہ بھی مختصر ہوگا۔ اگر خبر طویل ہو تو ابتدائیہ بھی اسی مناسبت سے قدرے طویل ہو جائے گا۔

ایسا ابتدائیہ جو جامع، مختصر معلوماتی اور حقائق پر مبنی ہو، خبر نویسی کی کامیابی کا راز ہے۔ کیونکہ یہی وہ حصہ ہے جو قاری سب سے پہلے پڑھتا ہے۔ یہ اگر قاری کو متوجہ کرسکا تو ٹھیک ورنہ وہ کسی اور خبر کی طرف رجوع کرتا ہے عموماً ابتدائیہ لکھنے کے لیے مندرجہ ذیل اصول ہیں:

- ابتدائیہ کو خبر کی مناسبت سے تحریر کیا جانا چاہیے۔
- ابتدائیہ اس طرح لکھا جائے کہ قاری خبر کی طرف مائل ہو جائے۔
- اسے مختصر سے مختصر ہونا چاہیے۔
- اس میں پوری خبر کا ماحصل آجائے۔
- ابتدائیہ کو چست، نتیجہ خیز اور دل کش ہونا چاہیے۔

ابتدائیہ اتنے دل کش انداز میں لکھا جائے کہ قاری خبر کو آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

ابتدائیہ لکھتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

- تفصیل سے احتراز۔
- پیچیدہ جملوں سے پرہیز۔
- واقعات عمومی نوعیت کے بجائے حتمی اور واضح ہوں۔
- ابتدائیے کا آغاز اعداد و شمار سے نہیں کرنا چاہیے۔ "35000 کے ایک جلوس نے مہنگائی کے خلاف مظاہرہ کیا" کے بجائے "ایک بڑے جلوس نے" کر دیا جائے تو خبر مؤثر ہو جاتی ہے۔ اگر اعداد و شمار ضروری ہوں تو انھیں ہندسوں میں لکھنے کے بجائے حروف میں لکھا جائے۔
- ابتدائیے میں "معلوم ہوا ہے"، "کہا جاتا ہے"، "خیال کیا جاتا ہے" کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے۔
- مصروف قاری سرخی اور ابتدائیے سے ہی واقعے کی پوری نوعیت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ لیکن اصولاً یہ بات درست نہیں ہے۔ اوّل تو یہ کہ اس سے ابتدائیہ کی طوالت کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ابتدائیے میں ساری تفصیلات دینے کے بجائے اسے قاری کو پوری خبر پڑھنے کی طرف راغب کرنے والا ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ اس میں تکرار سے اجتناب کرنا چاہیے۔

خبر کی سرخی:

عبدالسلام خورشید کے لفظوں میں "خبر کے عنوان کو سرخی کہتے ہیں(7)"

سرخی کے اہم مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

- خبر کا تعارف کرائے۔
- خبر کے اشتہار کا کام دے۔
- خبروں کی تقابلی اہمیت کو واضح کرے۔

صحافت کی ابتدا سے ہی سرخی کا مقصد، نفس مضمون کا تعارف اور مواد کی نوعیت کی نشاندہی رہا ہے۔ چونکہ یہ تشہیر کا دور ہے اس لیے سرخی کو جاذب بنا کر متن کو اشتہار کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آج زیادہ تر اخبارات کا مقصد قاری کی دل چسپی ابھار کر اس کی توجہ کھینچنا ہوتا ہے۔ یہ کام وہ سرخیوں کو پرکشش بنا کر انجام دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی خبر کو پڑھنے یا نہ پڑھنے کا انحصار بڑی حد تک سرخی پر ہوتا ہے۔ مگر کچھ قارئین اپنی دلچسپی کی خبریں تلاش کر کے پڑھتے ہیں خواہ وہ کسی سرخی سے ہو۔ مگر قارئین کی اکثریت ایسی ہوتی ہے جن کی کوئی مخصوص دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی دلچسپی ابھارنے میں سرخی کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ مسکین علی حجازی کامیاب سرخی کے اوصاف اس طرح بیان کرتے ہیں:

- خبر کے خلاصے یا اہم ترین نکتے کو صحیح طور پر بیان کرے۔
- خبر کے متن سے ہم آہنگ ہو۔
- خبر کے مزاج اور لہجے کی عکاسی کرے۔
- آسان اور قابل فہم ہو۔
- اس میں اخبار کی رائے کا اظہار نہ ہو۔
- قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے۔
- ضابطہ اخلاق کے اندر رہتے ہوئے پرکشش ہو۔
- اس میں الفاظ کی تکرار نہ ہو(8)

سرخیاں بنانا ایک تخلیقی عمل ہے۔ یہ مضمون نویسی، خبر نگاری اور کسی خبر یا مضمون کی تدوین سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اس میں چند نپے تلے الفاظ میں خبر کا خلاصہ بیان کرنا ہوتا ہے۔ اگر خبر یا مضمون کا اہم ترین نکتہ اس میں نہ آسکا تو سرخی ناکام ہو جائے گی۔ لہٰذا سرخی نگار میں خبر کی تہہ تک پہنچ کر اہم باتوں میں سے اہم ترین کا انتخاب کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ پھر اس اہم ترین بات کو مناسب ترین اسلوب میں تیکھے پن کے ساتھ پیش کرے۔ ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب اسے زبان و بیان پر قدرت اور الفاظ کے گوناگوں استعمال کا علم اور تجربہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مشق، مہارت کی تکمیل کرتی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا ہر دو خصوصیات کے باوجود کامیاب سرخی بنانے کے لیے مشق اور تجربے کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں جدت آفریں ذہن بھی معاون ہوتا ہے۔

خبروں کی طرح سرخیوں کا بھی ضابطہ اخلاق ہوتا ہے۔ سرخیوں کو پرکشش بنانے کی ضرورت انھیں سنسنی خیز بنانے کی ترغیب دے سکتی ہے اور ایسی جرأت زرد صحافت کے علم بردار اخبارات ہی کر سکتے ہیں۔

خبر کی زبان:

زبان کا بنیادی مقصد کسی اطلاع، مفہوم، خیال، تجربے، واقعے، کیفیت یا صورت حال کی پڑھنے یا سننے والوں تک ترسیل کرنا ہے۔ خبر چونکہ عوام کے

ایسے گروہ کے لیے ہوتی ہے جس میں مختلف تعلیمی سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا خبر کی زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان اور سادہ ہونا چاہیے۔ تحریری ذریعہ ترسیل میں جگہ کی کمی کی وجہ سے اور برقی ذرائع ترسیل میں وقت کی کمی کی وجہ سے Economy of word کا اصول برتا جاتا ہے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی سمو دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ ''وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے'' کی جگہ ''ان کی شادی ہوگئی''، ''توقع ہے کہ اس معاہدے پر جلد دستخط ہو جائیں گے۔'' کی جگہ ''اس معاہدے پر جلد دستخط ہو جانے کی امید ہے۔'' لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

خبر میں نامانوس اور مشکل الفاظ سے ہر صورت میں پرہیز کرنا چاہیے۔ ایسے سادہ اور آسان الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے جنھیں معمولی استعداد رکھنے والا قاری بھی سمجھ لے۔ کیونکہ برقی ذرائع ترسیل میں تو خواندگی کی شرط بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

> ''آسان اور سادہ الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ جملوں کی ساخت اور ترکیب بھی آسان ہونی چاہیے۔ مرکب اضافی یعنی اضافت کا کم سے کم استعمال کرنا چاہیے اور طویل جملوں کے بجائے مختصر جملے بنانے چاہئیں(9)۔''

کہا جاتا ہے کہ اخبار عوام کا معلم بھی ہوتا ہے، لیکن یہ مؤثر معلم تبھی ہو سکتا ہے، جب اس کی تحریر کی سطح دلچسپ ہو۔ سید اقبال قادری نے ادبی اور اخباری زبان کا موازنہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے:

> ''ادبی زبان فکر انگیز، خوب صورت، امتیازی اور جاذب نظر ہوتی ہے جب کہ اخباری زبان پر لطف، معلوماتی، جامع، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے(10)۔''

ادبی یا عام تحریر فرصت سے لکھی جا سکتی ہے، خاص ذہنی کیفیت طاری ہونے پر لکھی جا سکتی ہے، اپنی مرضی کے ماحول میں لکھی جا سکتی ہے۔ دوبارہ سہ بارہ نظر ثانی کر کے اسے نکھارا جا سکتا ہے مگر خبری تحریر کے لیے اتنی فرصت نہیں ہوتی۔ اس لیے خبر تحریر کرنے کے لیے صحافی کو زبان پر زیادہ قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام ادیب اپنی دلچسپی کے موضوع کا انتخاب کر سکتا ہے۔ صحافی کو عموماً یہ سہولت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ غیر صحافتی تحریر میں تشبیہ و استعارہ اور رمز و کنایہ کا استعمال کر کے بالواسطہ بات کہنے اور طویل کلام کے امکانات بھی ہوتے ہیں جب کہ صحافی ایسا نہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ عام علمی و ادبی تحریر میں کہیں کہیں زبان ذریعے کے بجائے مقصد بن جاتی ہے یعنی اثر پذیری کے پیش نظر مقفیٰ، مسجع یا پُر شکوہ زبان استعمال کر لی جاتی ہے۔ مگر خبر میں اس کی گنجائش نہیں۔

مختصر یہ کہ خبری تحریر میں:

- سادہ اور سلیس الفاظ کا استعمال ہو۔
- جملوں کی طوالت کم سے کم ہو۔
- تحریر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے۔
- متروک الفاظ و اسلوب اور گھسے پٹے جملوں سے احتراز کیا جائے۔
- غیر مروج الفاظ کا استعمال نہ ہو۔
- اپنی رائے شامل نہ کی جائے۔

حواشی:

1- احمد نسیم سندیلوی، ''خبر نگاری'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد-1992(ص-11)
2- سید اقبال قادری، ''رہبر اخبار نویسی'' ترقی اردو بیورو، نئی دہلی-1989(ص-56)
3- احمد نسیم سندیلوی، ''خبر نگاری'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد-1992(ص-15)
4- ایضاً (ص-42,43)
5- سید اقبال قادری، ''رہبر اخبار نویسی'' ترقی اردو بیورو، نئی دہلی-1989(ص-97)
6- ایضاً(ص-99)
7- عبدالسلام خورشید، ''فن صحافت'' مکتبہ کاروان، لاہور-1966(ص-139)
8- مسکین علی حجازی، ''فن ادارت'' اردو سائنس بورڈ، لاہور-1992(ص-164)
9- ایضاً(ص-166)
10- سید اقبال قادری، ''رہبر اخبار نویسی'' ترقی اردو بیورو، نئی دہلی-1989(ص-270)

□□□

C.I.L. School of Languages, JNU,
New Delhi-67

جوابات کوئز:

1- د	2- الف	3-ب	4-الف	5-الف	6-د
7-ج	8-ج	9-ب	10-الف	11-ب	12-الف
13-ب	14-ج	15-ب	16- ج	17-ج	18-الف
19-ج	20-د	21-ج	22-د	23-الف	24-الف
25-ب	26-ب	27-الف	28-ب	29-الف	30-ج
31-الف	32-الف	33-ب	34-د	35-الف	36-ب
37-ج	38-الف	39-د	40-ج	41-ج	42-د
43-الف	44-الف	45-الف	46-الف	47-ج	48-الف
49-الف	50-الف	51-الف	52-الف	53-الف	54-الف
55-ب					

سعید المظفر فاروقی

مقابلہ جاتی امتحانوں میں اردو طلبہ کی عدم شرکت کا مسئلہ

یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) حکومتِ ہند کا وہ ادارہ ہے جو مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں میں اعلا عہدوں کے لیے افسروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اِس انتخاب کے لیے قومی سطح پر امتحان اور انٹرویو لیے جاتے ہیں۔ سول سروسیز کے امتحان اٹھائیس مختلف قسم کی سروسیز کے لیے ہوتے ہیں جنھیں مجموعی طور سے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسیز (IAS) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن صوبائی حکومت کے مختلف شعبوں میں اعلا افسروں کا انتخاب ریاستی سطح پر امتحان اور انٹرویو کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ ادارے جن امتحانات کے ذریعے اُمیدواروں کا اِنتخاب کرتے ہیں انھیں مقابلہ جاتی امتحانات کہتے ہیں۔

قومی اور ریاستی سطح کے ان مقابلہ جاتی امتحانات میں شمولیت کے لیے کم از کم گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ اِن امتحانوں میں انگریزی یا ہندی زبان میں سوالات حل کرنے ہوتے ہیں۔ یہ سوالات اسکولوں اور کالجوں کے سوال ناموں کی نہج سے بُعد ہوتے ہیں، یعنی ان میں متبادل جوابات والے اور نفسِ امر سے متعلق (Objective Type) سوال ہوتے ہیں۔ ان سوالات کی مدد سے اُمیدواروں کی ذہانت، قوتِ ادراک، جامع الفاظ کا استعمال، مخصوص اندازِ فکر، اور ان کے وقت کے احساس و اہمیت کی جانچ کی جاتی ہے۔

تحریری امتحان میں مقرر کردہ معیار سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے اُمیدواروں کو اِنٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے جس میں ان کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ، اہلیت، ذوق و شوق، اظہار کی مہارت، قوتِ فیصلہ، شخصیت کا اندازہ، تنقیدی نکتہ نگاہ اور ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو پرکھا جاتا ہے۔

اِن مقابلہ جاتی امتحانات میں اُردو طلبہ کی عدم شرکت کے اسباب کا ذکر کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ اُردو والوں کی تعلیمی زبوں حالی کا اندازہ لگالیں۔

چھ تا چودہ سال کی عمر کے بچّوں میں اندازاً پچاس فیصد اسکول نہیں جاتے۔ جو پچاس فیصد اسکول جاتے ہیں ان میں پچیس فیصد غریبی اور خاندانی مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، یعنی کچی عمر میں ہی اسکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ باقی پچیس فیصد میں سے آدھا کریا تعلیم کو بے مصرف سمجھ کر یا فیل ہونے کے ڈر سے تعلیم حاصل کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر میں صرف پانچ فیصد اعلا ثانوی درجوں تک پہنچتے ہیں اور پڑھے لکھوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انداز اً اُردو والوں میں ہر پانچ میں سے تین اَن پڑھ ہیں۔

اردو اسکولوں سے فارغ گریجویٹس مقابلہ جاتی امتحانوں میں اِس لیے شریک نہیں ہوتے کہ انھیں ان کی مکمل معلومات نہیں ہوتی۔ امتحانوں کا معیار کافی اونچا، اعلا اور امیدواروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے طویل اور سخت تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب آیئے اردو طالب علموں کی صلاحیتوں کا تجزیہ کریں:

اردو پرائمری اسکولوں میں بچے کی تعلیم ٹھیک طور سے مکمل نہیں ہوتی کیوں کہ:

(i) پرائمری اسکولوں میں اساتذہ کے لیے تعلیمی لیاقت کا معیار یعنی ایس ایس سی اور ڈی ایڈ کورس ایک اچھا مدرس بنانے کے لیے ناکافی ہے۔

(ii) حکومت اپنے اکثر کام مثلاً مردم شماری، راشن کارڈ بنانا، مختلف قسم کے سروے، الیکشن ڈیوٹی وغیرہ پرائمری اساتذہ سے کرواتی ہے۔

(iii) ایک کلاس میں ایک ٹیچر تمام مضامین تنہا پڑھاتا ہے خواہ وہ خود بعض مضامین میں کمزور ہو۔

(iv) عمارتوں کی کمی کی وجہ سے پرائمری اسکولوں میں شفٹ سسٹم رائج ہے یعنی بچہ صرف چند گھنٹوں کے لیے اسکول میں رہتا ہے۔

(v) بچے کے گھر اور سماج کا ماحول بھی تعلیم کے لیے سازگار نہیں۔

ان حالات میں "کچھ پکّے زیادہ تر کچّے" بچے ہائی اسکولوں میں آتے ہیں۔

اردو ہائی اسکولوں میں روایتی طریقوں سے نصاب پورا کرنا ہی ٹیچر کا کام سمجھا جاتا ہے۔ چوں کہ بچے پڑھائی میں کمزور ہوتے ہیں اس لیے Short Cut راہ نکالنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی زبان میں مضمون لکھوانا ہے تو تختۂ سیاہ پر حرف بہ حرف لکھ دیا گیا اور بچوں نے نقل کر لیا۔ امتحانی پرچے میں جو پوچھنا ہے وہی سوال و جواب بچوں کو لکھا دیے گئے۔ ہوم ورک اول تو کم دیا گیا، پھر جو دیا گیا اس کی باریکی سے جانچ بھی نہیں کی گئی۔ زیادہ تر غلطیوں کی نشان دہی بھی نہ ہو سکی — اِن حالات میں اول تو بچے کا علم حاصل کرنے کا ذوق و شوق ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسلوب اور انداز فکر پیدا کرنا تو الگ رہا، ان میں مادری زبان میں اظہارِ خیال کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اردو ہائی اسکولوں میں عموماً انگریزی سکھانے کا معقول انتظام نہیں ہوتا۔ ایس ایس سی کے سوال نامے کو سامنے رکھ کر اساتذہ ترجمہ کے طریقے سے طلبہ کی کوچنگ

کر دیتے ہیں۔ اس طرح بچے امتحان میں کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن اعتماد کے ساتھ نہ انگریزی لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔

ایس ایس سی کے نتیجے پر آگے کی تعلیم کا تعین کیا جاتا ہے۔ ساٹھ فیصد سے کم نمبر حاصل کرنے والے خود کو آرٹس کے مضامین میں داخلہ لینے پر مجبور پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے سائنس یا کامرس میں چلے جاتے ہیں، جہاں ذریعہ تعلیم اردو کے بجائے انگریزی ہو جاتا ہے۔ بچے ماں باپ کی خواہش پوری کرنے یا اپنے عزیز دوست کا ساتھ دینے یا عملی زندگی میں داخل ہونے سے گریز کی خاطر یا تفریحاً جونیئر کالج میں داخلہ لیتے ہیں۔ چند بچے ہی کچھ مقصد لے کر پڑھائی جاری رکھتے ہیں۔ بارھویں کے نتائج بڑے حوصلہ شکن نکلتے ہیں۔ جب اسّی تا نوّے فیصد مارکس حاصل کرنے کے بعد بھی بچوں کو میڈیکل یا انجینئرنگ کے ڈگری کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا تو ان کی ہمت جواب دے جاتی ہے اور حوصلہ سرد پڑ جاتا ہے۔

زیادہ تر اردو اسکولوں میں ذہین بچوں کو مڈل اسکول اور ہائی اسکول اسکالرشپ کے سرکاری امتحانوں میں شریک نہیں کروایا جاتا۔ دسویں کے بچوں کو نیشنل ٹیلنٹ سرچ (N.T.S) کے امتحان میں شریک نہیں کروایا جاتا—ان امتحانات میں قومی اور ریاستی سطح کے مقابلہ جاتی امتحانوں کی طرز پر سوال نامے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس طرح بچے ان سے نامانوس رہتے ہیں۔

اردو طلبہ میں علمی مطالعے کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانوں کی تیاری کے لیے اردو زبان میں کوئی کتاب یا مواد میسر نہیں۔

Spoon Feeding کا عادی اردو طالب علم گرتے پڑتے گریجویٹ تو ہو جاتا ہے لیکن ہر معاملے میں وہ اپنے بڑوں کے فیصلے کا محتاج ہوتا ہے اور جن سے وہ رہنمائی چاہتا ہے، زیادہ تر وہ اس کے اہل نہیں ہوتے۔

اردو والے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ کسی بھی قسم کے مقابلہ جاتی امتحان میں ان کے ساتھ تعصب برتا جائے گا اور انھیں بہر حال کوئی موقع نہیں دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مقابلہ جاتی امتحانوں میں ان کی شرکت صفر سے تین فیصد کے اندر ہی رہتی ہے۔

اقلیتوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کی غرض سے 1983 میں آنجہانی اندرا گاندھی نے پندرہ نکاتی پروگرام شروع کیا۔ تمام ریاستوں کو پروگرام کی نقول اور ان پر عمل درآمد کرنے کی ہدایات روانہ کی گئیں۔ مقابلہ جاتی امتحانوں کی سلیکشن کمیٹیوں میں اقلیتی فرقے کی نمائندگی رکھی گئی، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بیس یونیورسٹیوں اور چودہ کالجوں میں اقلیتی امیدواروں کو مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے تیار کرنے کا انتظام کروایا۔

ان تمام باتوں کے باوجود تعلیم سے ہماری بے اعتنائی جاری رہی۔ تعمیری، فلاحی اور اصلاحی کاموں کے لیے اب تک ہم رائے عامہ نہیں بنا پائے۔ آج بھی ہماری ترجیحات میں تعلیم سب سے نیچے ہے۔

آیئے! اب کچھ حل کی بات کی جائے:

(1) اردو والوں کو تعلیم کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہوگا۔ ایک عام آدمی بہر طور اپنے بچوں کے لیے روزانہ کچھ وقت ضرور نکالے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے کی کوشش کرے، ان کی تعلیم کے لیے ضروری لوازمات مہیا کرے اور ہر طرح کی قربانیاں دینے کے لیے تیار رہے۔ سرپرست اور والدین کے تعاون کے بغیر کوئی ادارہ بچے کی اچھی تعلیم و تربیت نہیں کر سکتا۔

(2) اردو زبان میں تعلیمی مواد بروقت اور حسبِ معیار فراہم کرنے کی مؤثر اور سچی کوشش ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ صنعت کار اردو میں طباعت و اشاعت کے شعبے میں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائیں اور اردو طلبہ کو مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لیے اردو میں ان کی ضرورت کا مواد مہیا کریں۔

(3) اسکول چلانے والی انجمنیں اور ان کے اراکین اقتدار کی رسہ کشی کا کھیل ختم کریں۔ اقربا پروری اور ڈونیشن کی حرص سے باز آئیں۔ قابل، محنتی اور مخلص اساتذہ کا ہی تقرر کریں۔ کام کرنے کے لیے بہتر ماحول پیدا کریں، زیادہ سے زیادہ بال واڑیاں، پری پرائمری اور پرائمری اسکول کھولے جائیں۔ صاف ستھری، کشادہ اور ہوادار عمارتوں میں ایسے لوازمات مہیا کیے جائیں جن سے بچوں کی گوناگوں صلاحیتیں جلا پائیں۔ شفٹ سسٹم ختم کیا جائے اور اچھے نتائج پر بچوں اور ان کے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات دیے جائیں۔

(4) اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر حضرات مستقبل کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ صرف ایس ایس سی، یا ایچ ایس سی کے نتائج کو اپنا مقصود نہ بنائیں۔ ذہین بچوں کو سرکاری اسکالرشپ کے امتحانات خصوصاً این ٹی ایس کے امتحان میں ضرور شریک کرائیں۔ قابل اور محنتی اساتذہ سے ان پر خوب محنت کروائیں۔

ہر اردو ہائی اسکول میں ایک کیریئر کانسلر ہو جو نئے نئے پیشوں سے نہ صرف واقف ہو بلکہ بچوں کے لیے مفید اور بہتر پیشوں کی معلومات انھیں دیتا رہے۔

پیشوں سے متعلق لٹریچر خواہ کسی زبان میں ہو، مہیا کیا جائے۔

قومی سطح کے اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات و رسائل بچوں کو پڑھنے کے لیے مہیا کیے جائیں۔ بچوں میں جوش و خروش اور تحریک پیدا کرنے کے

لیے کوئز، تحریری اور تقریری مقابلے منعقد کروائیں۔ بچے کے ذہن میں یہ بات نقش کردی جائے کہ اسے بہر حال اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے اور اپنے آپ کو مخصوص پیشے کے لیے تیار کرنا ہے۔

ذہین بچوں کو انگریزی میں بات چیت کرنے کی ترغیب دی جائے۔

(5) اساتذہ طلبہ سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ ان کی ذمّے داری ہے کہ وہ بچوں میں خود اعتمادی پیدا کریں۔ کمزور بچوں کو بھی ہمت اور حوصلے سے پڑھائی کرنے کی ترغیب دیں۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد بچوں سے رابطہ قائم کریں اور زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے ان کی رہنمائی کرتے رہیں۔

(6) بارھویں کے بعد گریجویشن کرنے کے لیے کم از کم تین سال درکار ہیں۔ اگر تین برسوں میں مندرجہ ذیل باتوں پر سختی اور پابندی سے عمل کیا گیا تو اوسط درجے کی صلاحیتیں رکھنے والا امیدوار بھی مقابلہ جاتی امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

(i) ایس ایس سی کے بعد سوچ سمجھ کر آرٹس، سائنس یا کامرس میں سے کوئی ایک شعبہ چنیں۔ اپنی دلچسپی کے مطابق وہی مضامین منتخب کیے جائیں جن میں طلبہ کی دلچسپی ہو اور جسے وہ آسان سمجھتے ہوں۔

(ii) مضامین کے نصاب کا بغور مطالعہ کرکے کوئی اچھی سی نصابی کتاب تیاری کے لیے منتخب کرلیں۔ کالج میں لیکچر کے ساتھ ساتھ کتاب کا مطالعہ بھی جاری رکھیں۔ مشکل نکات کو اپنے اساتذہ سے حل کرا اچھی طرح سمجھ لیں۔

(iii) ہر مضمون میں خود سے نوٹس بنائیں اور اسے استاد سے درست کروالیں۔

(iv) موقع ملے تو تحریری اور تقریری مقابلے میں پوری تیاری سے حصہ لیں۔

(v) قومی سطح کے انگریزی اخبارات و رسائل کا باقاعدہ مطالعہ جاری رکھیں تاکہ حالاتِ حاضرہ کا علم بھی ہوتا رہے اور انگریزی بھی سیکھ سکیں۔

(vi) کسی بھی معاملے میں اپنی ذاتی رائے قائم کیجیے اور دلائل کے ذریعے اُسے درست ثابت کرنے کی کوشش کیجیے۔

(vii) ایسے دوستوں کا گروپ تیار کیجیے جو آپس میں انگریزی میں بات چیت کریں۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف موضوعات پر مباحثے بھی کریں تاکہ وہ ذہن نشیں ہو جائے۔

(viii) عام معلومات اور مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لیے بازار میں مخصوص کتابیں دستیاب ہیں۔ ان میں سے عام فہم زبان میں لکھی ہوئی کتاب چُن لیں اور اس کا باقاعدہ مطالعہ کریں۔

(ix) مقابلہ جاتی امتحانات کی مکمل معلومات، ان کی تیاری اور ان کے نمونے کے سوالات بعض رسائل میں ہر ماہ ترتیب سے دیے جاتے ہیں۔ قومی سطح کے ایسے کئی کیریئر ماہنامے جو اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوئے ہیں، ان کے نام درج ذیل ہیں:

(1) Career and Competition Times.
(2) Competition Success Review.
(3) Competition Master.
(4) Civil Services Chronicle.
(5) प्रतियोगिता दर्पण

ان میں سے کسی ایک کا باقاعدہ مطالعہ اور ان میں شائع شدہ نمونے کے سوالات کے حل کرنے کی چند سال مشق کی جائے تو مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی عین ممکن ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ "آموزگار" جلگاؤں، سالنامہ 2002، مہاراشٹر)

□□□

پانچ جدید مغربی ڈرامے

ترجمہ اور تعارف : زاہدہ زیدی

ان پانچوں ڈراموں کا شمار جدید مغربی تھیٹر کے اہم ترین فن پاروں میں ہوتا ہے۔ ہمہ گیر وژن، فنی ندرت اور گہری معنویت کے حامل یہ ڈرامے قبولِ عام کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے مصنفین ہیں یوجین ایونیکو، مینول دی پیدرو لو، ژاں پال سارتر اور سیموئل بیکٹ۔

(پہلا ایڈیشن)، صفحات: 406، قیمت: 126.00 روپے

اردو زبان کا جادو (حصہ اوّل، دوم)

مرتبین: مسز پی. شیاملا کماری
پروفیسر ماہ جبیں نجم

اردو سکھانے والی دو آسان کتابیں

جو تدریسِ زبان کے جدید سائنٹفک اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے ساتھ ساتھ اردو سیکھنے والے بالغوں کے لیے بھی کار آمد ہیں۔

(حصہ اوّل، قیمت: 43 روپے)، (حصہ دوم، قیمت: 46.00 روپے)

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

ایم۔اے۔ قریشی

اسپیس شٹل

ناسا نے 1992 میں ایک اسپیس شٹل بنانا شروع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو راکٹ کے انداز میں فضا میں بھیجا جا سکے۔ وہ ایک جہاز کی طرح پرواز کرے اور پھر اسے زمین پر اُتارا بھی جا سکے۔ یہ نقل و حمل کا انوکھا نظام ہے جس کے ذریعے سٹیلائٹ اور آلات کی خارجی خلا میں صف بندی ہو۔ دراصل یہ ایک ٹیکنالوجیکل عجوبہ تھا جسے بار بار استعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے راکٹوں کا استعمال ہوتا تھا۔ ان کے ذریعے خلا بازوں اور آلات کو زمین کے مدار میں قائم کیا جاتا تھا اور یہ راکٹ استعمال کے بعد ضائع ہو جاتے تھے۔ بنیادی طور پر اسپیس شٹل ایک چکر لگانے والی مشین ہوتی ہے جو خلا بازوں اور آلات کو لے کر چلتی ہے۔ یہ مشین دو راکٹ بوسٹروں اور خارجی ایندھن ٹینک سے منسلک ہوتی ہے۔

خلا میں چکر لگانے والی پہلی مشین کا نام "انٹر پرائز" رکھا گیا۔ یہ مشین ایک سائنس فکشن پر مبنی فلم "اسٹار ٹریک" کے خلائی جہاز کے نام سے منسوب تھی۔ انٹر پرائز کو بوئنگ 747 کے ذریعے فضا میں اُڑایا گیا۔ اس طرح اس مشین کے کنٹرول کے پہلوؤں اور ڈیزائن کو ٹیسٹ کیا گیا۔ آخر کار کئی برسوں تک اسپیس شٹل کی تعمیر اور اس کے حصّوں کا ٹیسٹ کرنے کے بعد ناسا نے چار شٹلوں کے ڈیزائن تیار کیے۔ ان کے نام تھے: کولمبیا (1981)، چیلنجر (1982)، ڈسکوری (1983) اور اٹلانٹس (1985)۔ ناسا کے اسپیس پروگرام کے جواب میں روس نے جو اسپیس شٹل ڈیزائن کیا، اس کا نام "بوران" تھا جس کا روسی زبان میں مطلب ہے برفیلا طوفان۔ ناسا کی پہلی فلائٹ 1981 میں کولمبیا کے ساتھ شروع ہوئی۔ کولمبیا سب سے پرانی شٹل ہے جس کا آج وجود نہیں ہے۔

اسپیس شٹل جس کا وزن 20 لاکھ کلو گرام ہو، اس کو لانچنگ پیڈ سے اوپر اُڑانے اور 185 سے 645 کلو میٹر تک زمین سے اُوپر خلائی مدار میں لے جانے کے لیے شٹل میں دو راکٹ بوسٹرز استعمال ہوتے ہیں جن سے ایک کروڑ 17 لاکھ این کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ لانچنگ پیڈ پر مزید یہ راکٹ بوسٹرز اسپیس شٹل کا چکر لگانے والی مشین اور ایندھن کے سارے وزن کے بوجھ کو سہار لیتے ہیں۔

ایک دفعہ خلا میں داخل ہونے کے بعد شٹل کا چکر لگانے والی مشین 7 سے 14 دنوں کے لیے خلا بازوں کا گھر بن جاتی ہے۔ اس میں خلا بازوں کی رہائش کی مدت کا انحصار خلائی مشن کے مقصد پر ہوتا ہے۔ اس مشین میں مندرجہ ذیل حصّے ہوتے ہیں:

عملہ کا کمپارٹمنٹ:

اس کمپارٹمنٹ میں تین عرشے ہوتے ہیں: فلائٹ عرشہ یا سب سے اُوپری عرشہ جس میں شٹل کے کنٹرول اور وار نگ کے سارے نظام ہوتے ہیں۔ درمیانہ عرشہ جس میں رہائشی کمرے، ذخیرہ اندوزی کے لیے کمرے اور ورزش وغیرہ کے آلات ہوتے ہیں۔ تیسرا عرشہ سب سے نیچے ہوتا ہے، اس میں دیگر معاون آلات، بجلی کا نظام وغیرہ ہوتے ہیں۔

شٹل کے ڈھانچے کا اگلا حصہ:

اس میں عملہ کے کمپارٹمنٹ کے معاون آلات (مثلاً ایندھن، بیٹریاں، گیس ٹینک) ہوتے ہیں۔

او ایم سی/آر سی ایس پوڈز:

اس حصّے میں شٹل کو مدار میں چلانے کے انجن اور آر سی ایس ماڈیول ہوتے ہیں جو شٹل کو موڑ دینے اور مدار کی تبدیلی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

کنٹرول نظام ماڈیول:

اس میں فارورڈ راکٹ جیٹس ہوتے ہیں جن سے شٹل کو مختلف سمتوں میں موڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔

متحرّک ہوائی تالا (Air Lock):

یہ خلا بازوں کے خلا میں چلنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

درمیانی ڈھانچہ:

اس میں وہ تمام ضروری حصّے ہوتے ہیں (گیس ٹینک، بجلی کے تار وغیرہ) جن سے عملہ کے کمپارٹمنٹ کو انجن سے جوڑا جاتا ہے۔

کارگو بے دروازے:

چکر لگانے والی مشین کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے یہ دروازے ہوتے ہیں۔

ریموٹ مینی پولیٹر نظام:

یہ ایک لمبا بازو ہوتا ہے۔ اس کے کو ہنی اور کلائی کے جوڑ ہوتے ہیں۔ اس بازو کو فلائٹ کے عرشے سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ بازو "کارگو بے" سے سٹیلائٹ کو مٹھی میں پکڑ سکتا ہے۔ یہ اس کی صف بندی کرتا ہے یا اس کو

پکڑ کر "کارگو بے" میں رکھ دیتا ہے۔

شٹل کا عقبی ڈھانچہ:

اس میں مرکزی انجن ہوتا ہے۔

چکر لگانے والی مشین کے ہوائی جہاز نما حصے:

شٹل کی لانچ کے بعد یہ حصے اس کی ہوائی پرواز میں مددگار ہوتے ہیں۔

شٹل میں سیال آکسیجن اور نائٹروجن دباؤ والے دو ٹینکوں کے نظام میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ ٹینک ڈھانچے کے درمیانی حصے میں ہوتے ہیں۔ کیبن کے دباؤ کا نظام ان دونوں گیسوں کو ملا کر ایک صحیح مرکب نارمل فضائی دباؤ بناتا ہے۔ یہ گیسوں کا مرکب شٹل میں ہر طرف چکر لگاتا رہتا ہے۔ یہ چکر کھاتی ہوئی ہوا اپنے اندر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی گرمی اور نمی کو جذب کر لیتی ہے۔ مشین کے سارے نظام کو ٹھیک طور سے کام کرنے کے لیے بجلی کی قوت اینڈ حسن کی بیٹریوں سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ بیٹریاں دباؤ والے ٹینکوں سے ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملا کر بجلی اور پانی بناتی ہیں۔ یہ ڈھانچے کے درمیانی حصے میں ہوتی ہیں۔

شٹل میں ہوا کے علاوہ پانی سب سے اہم ضرورت ہوتی ہے۔ اینڈ حسن کی بیٹریاں گیارہ کلوگرام پانی فی گھنٹہ بناتی ہیں۔ پانی کے سب سے نیچے والے عرشے پر ٹینکوں میں ذخیرہ اندوزی کی جاتی ہے۔ پانی کے ٹینکوں پر نائٹروجن گیس کے ذریعے دباؤ رکھا جاتا ہے تاکہ عملے کے استعمال کے لیے پانی بہہ کر درمیانہ عرشے تک آ جائے۔ پینے کے لائق پانی کو فلٹر کر کے اور اس کے استعمال کے مطابق ہیٹ ایکس چینجر آلے کے ذریعے پانی کو ٹھنڈا یا گرم کیا جاتا ہے۔ شٹل کا درجہ حرارت کنٹرول نظام گرمی کی تقسیم میں مدد کرتا ہے۔ مثلاً کیبن کی گرمی، ایکس چینجر گھومتے ہوئے ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے فالتو گرمی کو دور کرتا ہے اور اس گرمی کو "فری آن ایکس چینجر" منتقل کر دیتا ہے جو گرمی کو آگے چکر لگاتی مشین کے دوسرے نظام میں منتقل کرتا ہے اور فالتو گرمی کو لہروں کی شکل میں باہری خلا میں چھوڑ دیتا ہے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ شٹل میں صفائی رکھی جائے خصوصاً جب کہ خلا میں دھول اور ملبہ تیر رہے ہوں کیونکہ ان سے شٹل کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ عام طور پر صفائی رکھنے کے لیے اعلا درجے کے مشینی وائپر اور گیلے و خشک ویکیوم کلینر استعمال کیے جاتے ہیں۔ کوڑے کو گیلے اور خشک تھیلوں میں الگ کیا جاتا ہے۔ ان کو نچلے عرشے پر حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ زمین پر پہنچنے کے بعد ان کو پھینک دیا جاتا ہے۔ ٹوائلٹ کے ٹھوس فضلہ کو دبا کر اور خشک کر کے تھیلوں میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ٹوائلٹ کی گیسوں سے حاصل سیال فضلہ کو گندے پانی کے ٹینکوں میں رکھا جاتا ہے۔

خلا میں سب سے زیادہ خطرہ آگ سے ہوتا ہے۔ آگ لگنے کا پتہ لگانے اور اس کو بجھانے کے کئی نظام ہوتے ہیں۔ ان میں عرشے پر دھوئیں کا پتہ لگانے کے آلات، غیر زہریلی آگ بجھانے والے سفری آلات، عملہ کے ارکان کے لیے سانس لینے کا سامان، الارم اور وارننگ دینے والی روشنیاں ہر ماڈیول میں ہوتی ہیں۔

شٹل میں خلا بازوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے زمینی کنٹرول مشن ایک ریڈیو انٹینا کو سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ یہ انٹینا اس سگنل کو مدار میں ایک ساتھ گھومتے ہوئے ٹریکنگ اور ڈاٹا ریلے سٹیلائٹوں کو بھیجتا ہے۔ یہ سٹیلائٹ سگنل کو اسپیس شٹل کو بھیج دیتے ہیں۔ یہ رابطے کا نظام اسی طرح واپسی سگنلوں کو شٹل سے سٹیلائٹوں کو اور ان سے زمینی کنٹرول کو بھیجتا ہے۔ ذاتی کمیونی کیشن کے لیے عملے کے کمپارٹمنٹ میں انٹرکام ویڈیو ٹرمنل لگے ہوتے ہیں۔

خلا بازوں کے شٹل سے باہر خلا میں چلتے وقت کمیونی کیشن کے لیے ایک یو ایچ ایف فری کوینسی کا نظام استعمال کیا جاتا ہے اس فری کوینسی کو خلا باز کے سوٹ کے اندر لگا آلہ پکڑ لیتا ہے۔ شٹل میں گلوبل پوزیشننگ سسٹم (جی پی ایس) ہوتا ہے جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ شٹل کس مقام پر ہے اور وہ کس سمت جا رہا ہے۔ اس میں کئی سائیرو اسکوپ ہوتے ہیں جن سے اُونچائی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ شٹل میں خصوصی کمپیوٹر لگے ہوتے ہیں جو ہر طرح کی معلومات و ڈاٹا کی پروسیسنگ کرتے رہتے ہیں اور سنگین موقعوں پر فلائٹ کو کنٹرول کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

جب مشن پورا ہو جاتا ہے تو عملہ "کارگو بے" کے دروازے بند کر دیتا ہے اور راکٹ بوسٹر کے ذریعے شٹل کی دُم کو سب سے پہلے موڑ دیا جاتا ہے۔ او ایم ایس انجنوں سے شٹل کی رفتار کم کی جاتی ہے اور وہ زمین کی طرف آنا شروع کرتی ہے۔ شٹل کو خلا سے فضا کی اُوپری سرحد تک آنے میں 25 منٹ کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ اس وقفے کے دوران عملہ راکٹ بوسٹر چھوڑتا ہے تاکہ شٹل کا نچلا حصہ زمینی فضا کی جانب ہو، 40 ڈگری کا زاویہ ہو اور اس کی چونچ پہلے آگے بڑھ رہی ہو۔ فضا میں داخلے کے وقت شٹل کو بہت زیادہ گرمی کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر جتنا بھی اینڈ حسن فارورڈ آر سی ایس میں بچا ہوتا ہے، اس کو جلا دیا جاتا ہے۔ شٹل زبردست رفتار یعنی 20 ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہوتی ہے۔ اس کی مڈبھیڑ فضا میں جب ہوا سے ہوتی ہے تو ہوائی رگڑ سے بہت زیادہ گرمی پیدا ہوتی ہے اور درجہ حرارت 650 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ شٹل کو گرمی کی تباہی سے بچانے کے لیے اس کو خصوصی ٹائیلوں سے ڈھکا جاتا ہے۔ فضا میں کامیابی کے ساتھ داخل ہونے کے بعد شٹل ایک جہاز کی طرح پرواز کرنے لگتی ہے۔ اس کے لیے فلائٹ کمپیوٹر کام میں لیے جاتے ہیں۔

مستقبل کا پروگرام یہ ہے کہ اسپیس شٹل ہلکی، محفوظ اور زیادہ کارگر ہو، اس کے لیے جو تبدیلیاں کی جائیں گی ان میں انجنوں کے ڈیزائن، سیلوں (یعنی جوڑ لگانا)، فلٹروں، راکٹ بوسٹر کے نظام کے اینڈ حسن کو بہتر بنانا اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو مزید مؤثر بنانا شامل ہیں۔ □□□

(بشکریہ "سائنس کی دنیا"، جنوری-مارچ 2003)

بھرت جھنجھن والا

گاؤں کی موت

"گاؤں" لفظ کو سنتے ہی آنکھوں کے سامنے چوپال پر بیٹھے حقہ پیتے مست مرد اور پنگھٹ پر شور مچاتی عورتوں کی تصویر آجاتی ہے۔ گاؤں کا اپنا نظام تھا، سب مل جل کر رہتے تھے۔ شہر سے انھیں زیادہ لینا دینا نہیں تھا۔ راجہ سے سال میں ایک مرتبہ ٹیکس ادا کرنے کے لیے رابطہ ہوتا تھا۔ اناج اور کھی وغیرہ کی شکل میں ٹیکس ادا کر دیا جاتا تھا۔ اپنی باقی ضروریات کو گاؤں خود پورا کر لیتا تھا۔ بڑھئی، لوہار، سنار، موچی سبھی گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں پوری طرح خود مختار تھا۔

لوگوں کی اوّلین ضرورت اناج کی پیداوار تھی۔ اسی پر روزگار کا انحصار تھا اور اناج سے ہی ٹیکس بھی ادا کیا جاتا تھا۔ کھیتی کے لیے بیل ضروری تھا۔ جتائی اور دنوائی بیل سے ہی ہوتی تھی۔ سینچائی بھی کبھی کبھی رہٹ سے کی جاتی تھی جسے بیل سے چلایا جاتا تھا۔ بیل پیدا کرنے کے لیے گائے کی ضرورت پڑتی تھی۔ گائے سے دودھ بھی بائی پروڈکٹ کی شکل میں مل جاتا تھا۔ گائے، بیل کو چرانے کے لیے چراگاہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ کھیت سے ہونے والے چارے ہی سے ان جانوروں کا پیٹ بھرنا اکثر مشکل ہو جاتا تھا۔ گائے کو نصف خوراک چراگاہ سے مل جاتی تھی۔ گائے کے چرنے سے بچی ہوئی گھاس سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھیڑ، بکریاں پالی جاتی تھیں۔ ان سے دودھ، اون اور گوشت مل جاتا تھا۔ اس نظام کو چلانے کے لیے گاؤں میں تمام پیشے تھے۔ بڑھئی اور لوہار ہل بناتے تھے۔ چرواہا جانوروں کو چراتا تھا، بلواہا بیلوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ گوالے گائے کا دودھ بیچتے تھے لیکن ٹریکٹر نے سب کچھ بدل دیا۔ جتائی اور دنوائی کے لیے بیل کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ بیل کی گرتی قیمت نے گائے کی اقتصادیات کو بگاڑ دیا۔ آبپاشی ٹیوب ویل سے ہونے لگی۔ رہٹ کے لیے بھی بیل کی ضرورت نہیں رہی۔ ساتھ ہی ساتھ چراگاہ بھی ختم ہونے لگے۔ اس پر گاؤں کے دبنگ لوگوں نے ذاتی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ماضی میں ایسا کرنا مشکل تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ چراگاہ نہ ہونے سے گائے بیل کا پیٹ نہیں بھر پائے گا۔ گاؤں کے تمام لوگ ناجائز قبضہ کو روکنے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ اب سبھی یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں بھی ناجائز قبضے کا موقع مل جائے۔ چراگاہیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ چراگاہوں کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ بھیڑ بکریوں کی تعداد میں بھی کمی آنے لگی۔ اون کی صنعت ختم ہونے لگی۔ پہلے اون کی چادریں گاؤں میں بُنی جاتی تھیں، اب لدھیانہ سپلائی ہوتی ہیں۔ بڑھئی، لوہار، چرواہے، بلواہے اور گوالوں کی جگہ ٹریکٹر ڈرائیور، ڈیزل کے دکاندار، موٹر وائنڈر نے لے لی۔ موٹر، ڈیزل اور بجلی کے لیے گاؤں شہر پر منحصر ہو گیا۔ اس کی خود مختاری ختم ہو گئی۔

دوسری تبدیلی کھاد کے ضمن میں ہوئی۔ پرانے نظام میں کھیت سے پیدا شدہ چارہ گائے بیل کو کھلایا جاتا تھا۔ گوبر کا استعمال ایندھن اور کھاد کے لیے کیا جاتا تھا۔ کھیت کی طاقت اس کھاد سے بنی رہتی تھی۔ لیکن چارہ سے بنی یہ کھاد کافی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے گائے اور بکری کے گوبر کا استعمال بھی کھاد کے لیے کیا جاتا تھا۔ کھیت کی طاقت کے پیچھے چراگاہ تھے۔ چراگاہ میں نرائی سے گوبر ہوتا تھا اور اس سے اُپلہ اور کھاد بنایا جاتا تھا۔ گاؤں کی ایندھن کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ چراگاہ سے کچھ ایندھن بھی مل جاتا تھا۔ تمام جنگلی جھاڑیوں کو کاٹ کر گھر کا چولھا جلایا جاتا تھا۔ ایک سلسلہ تھا۔ کھیت مویشیوں کو چارہ دیتے تھے۔ مویشی کھیت کو کھاد اور انسان کو ایندھن دیتے تھے۔ چراگاہ مویشی کو چارہ اور انسان کو ایندھن دیتے تھے۔ گاؤں اپنے ایندھن اور کھاد کی ضروریات خود پوری کر لیتا تھا۔

کیمیائی کھادوں اور کراسن تیل نے گاؤں کی اس خود مختاری کو ختم کر دیا ہے۔ کھیت کی خوراک کیمیائی کھادوں سے پوری کی جانے لگی ہے جس کی وجہ سے کھیت کی طویل مدتی پیداواری صلاحیتیں کم ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے کسانوں نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے۔ وہ اتنی ہی کیمیائی کھاد کا استعمال کرتے ہیں، جس سے کھیت برباد نہ ہو۔ ساتھ میں تھوڑی مقدار میں گوبر کی کھاد کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ہری کھاد کا استعمال کر کے گوبر کی کمی پوری کر لیتے ہیں۔ کھیتی کے لیے اب نہ تو گائے بیل ضروری رہ گئے ہیں، نہ ہی چراگاہ۔ ایندھن کا کام گیس اور مٹی کے تیل سے ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی مویشیوں اور چراگاہوں کی ضرورت نہیں رہی۔ ان تبدیلیوں کے سبب آہستہ آہستہ گاؤں کیمیائی کھاد اور کراسن تیل کے لیے شہر پر منحصر ہو گیا اور اس کی خود مختاری ختم ہو گئی۔

پہلے شہر گاؤں پر اناج کے ساتھ ساتھ دودھ کے لیے بھی انحصار کرتے تھے۔ صبح دودھ والے سائیکلوں اور ریل سے دودھ شہر پہنچاتے تھے۔

اب یہ کام بھی شہر میں ہونے لگا ہے۔ پہلے چارے کو دودھ میں بدلنے کے لیے گائے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ گائے کے لیے چراگاہ کی ضرورت تھی۔ دیسی گائے کو باندھ کر نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن بھینس اور غیر ملکی گائے کو چرنا پسند نہیں ہے۔ وہ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنا پسند کرتی ہیں۔ اس سے چارے کو دودھ میں بدلنے کا کام شہر میں کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ چارے کو ٹرکوں کے ذریعے شہر پہنچادیا جاتا ہے اور گوبر کی کھاد کی ٹرالی واپس گاؤں پہنچ جاتی ہے۔ یہ کام بھی گاؤں کے ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔

پہلے گاؤں شہر کو صرف ٹیکس دیتا تھا، اس سے کچھ لیتا نہیں تھا۔ اپنے لیے کھاد، ایندھن اور دودھ کا انتظام گاؤں خود کرلیتا تھا۔ گاؤں کے لوگ گاؤں میں ہی مصروف رہتے تھے۔ تقریباً تمام پیشوں سے وابستہ لوگوں کے کھیت ہوتے تھے۔ بارش ہونے پر بڑھئی، سنار، چمار سبھی اپنا پیشہ ورانہ کام چھوڑ کر کھیتی میں لگ جاتے تھے۔ یہ پیشے اب ختم ہونے لگے ہیں۔ گاؤں کو نہ تو بڑھئی کی ضرورت رہی، نہ لوہار کی۔ موٹر وائنڈر اور ٹریکٹر میکینک شہروں یا قصبوں میں رہتے ہیں۔ گاؤں کے لیے روزگار نہیں بچے۔ وہ کھیتی کا کام ہوجانے کے بعد شہر جانے لگے۔ آج ملک کے ایک تہائی لوگ رہتے گاؤں میں ہیں لیکن ان کی تین حصہ آمدنی ملتی ہے شہر کے پیسے سے۔ شہر سے لوگ پیسہ گھر بھیجتے ہیں جس سے گاؤں میں پختہ مکان بنائے جارہے ہیں۔ شہری پیسے کا بول بالا ہے۔ گاؤں کا ہر باپ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا شہر میں سیٹ ہوجائے۔ جو گاؤں شہر کو ٹیکس دیتا تھا، وہ شہر سے مزدوری لینے لگا ہے۔ گاؤں کے اجتماعی کام جیسے پانی کے کنویں اور چوپال کی تعمیر وغیرہ بھی اب شہر کے پیسے سے ہونے لگے ہیں۔

پہلے پنچایت دن طے کردیتی تھی۔ اس دن گاؤں کے سب لوگ مل کر صفائی کرتے تھے یا سڑک کی مرمت کرتے تھے۔ اب پنچایت کو ضلع ہیڈ کوارٹر سے ان کاموں کے لیے فنڈ ملتا ہے۔ ڈیزل، بجلی، کرائن تیل اور روزگار کے لیے گاؤں کو شہر کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کھیتی کا یہ شہری کرن دیرپا ہے؟ اصل مسئلہ پیٹرولیم اشیا کا ہے۔ بجلی بھی زیادہ تر کوئلے اور تیل سے ہی بنتی ہے۔ یہ نظام اس وقت تک ہی چل سکتا ہے جب تک پیٹرولیم اشیا کے ذخیرے موجود ہیں۔ چونکہ یہ ذخائر محدود ہیں اس لیے یہ دیرپا نہیں ہوسکتے۔ پھر بھی اس صورت حال تک پہنچنے میں ابھی 100-50 برس لگیں گے۔ اس وقت تک تکنیکی ترقی سے توانائی کے نئے وسائل بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ہوا، ایٹمی اور شمسی توانائی کا بہت فروغ ہورہا ہے، یہ ذرائع دیرپا ثابت ہورہے ہیں۔ ممکن ہے کہ پن چکی سے بجلی بنائی جائے، بجلی سے ہائیڈروجن پیدا کی جائے اور ٹریکٹر کو ہائیڈروجن سے چلایا جائے۔ گنے سے چینی کے بجائے ایتھنول بناکر اس سے بھی ٹریکٹر کو چلایا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے تمام امکانات موجود ہیں۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ تمام کوششیں ناکام ہوجائیں گی تب بھی شہری کرن کو نہیں روکنا چاہیے۔

ہاں یہ کوشش ضرور ہونی چاہیے کہ گاؤں سے شہروں کی طرف جو بڑے پیمانے پر ہجرت ہورہی ہے، اس میں کمی آئے اور گاؤں کو خود کفیل بناکر انھیں ایک نئی زندگی دی جائے۔ □□□

732, Modern Society, Sector 15, Rohini,
Post Box 10754, Delhi-110 085

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Ph.: 26109746, 26169416 Fax: 26108159 e-mail: urdueducation@hclinfinet.com

کتابوں کی نمائش و فروخت آپ کے شہر آپ کے گاؤں میں

موبائل وین سے اردو کتابوں کی نمائش و فروخت کے تجربے میں اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر میں ہمارے اردو قارئین نے جس جوش و خروش سے کتابیں خریدیں اور کتب بینی کی روایت میں نئی روح پھونکی، اس نے کونسل کے ولولے دوبالا کیے ہیں۔ جموں و کشمیر کی دور دراز اردو بستیوں میں آپ کے ہاتھوں تک اردو کا سرمایہ پہنچانے کے لیے یہ موبائل وین اب حسب ذیل پروگرام کے مطابق آپ کی بستی میں پہنچے گی۔

28 تا 30 اگست	جموں	05 تا 07 ستمبر	پلوامہ	14 تا 15 ستمبر	چرار شریف
31 تا 01 ستمبر	ادھم پور	08 تا 11 ستمبر	سری نگر	16 تا 18 ستمبر	بارہ مولہ
03 تا 04 ستمبر	اننت ناگ	12 تا 13 ستمبر	بڈگام	19 تا 21 ستمبر	سوپور

نوٹ: شناختی کارڈ دکھانے پر اساتذہ اور طلبہ کے لیے 40% رعایت

قمر رئیس

رفیقِ سفر بھیشم ساہنی کی یاد میں

تقسیم اور آزادی کے بعد جن باکمال ادیبوں نے ہندستانی ادب میں ایک منفرد جگہ بنائی، ان میں بلاشبہ بھیشم ساہنی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے خاموشی، سبک روی، لیکن پورے انہماک اور لگن سے لکھا اور اس لیے لکھا کہ ان کے پاس اپنے قارئین کو کچھ دینے کو تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ہندی اور بلکہ ہندستانی ادب اور اس کے تصور کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک ملاقات میں بھیشم جی نے مجھے بتایا تھا کہ چند سال قبل ہی انھوں نے اپنی سرگرم تصنیفی زندگی کی نصف صدی پوری کی تھی۔

بھیشم ساہنی صرف ایک قلم کار نہیں تھے۔ وہ اشتراکی فکر کی نظریاتی تحریک کے سرگرم پیروکار بھی تھے، ان کے سامنے زندگی کے کچھ آدرش تھے، دبے کچلے انسانوں کے ساتھ وابستگی اور دردمندی کا اٹوٹ رشتہ تھا۔ یہی وہ راستہ تھا جس پر میں ان کے ساتھ اور ان کی قیادت میں گذشتہ ربع صدی سے چل رہا تھا۔ سجاد ظہیر صاحب کے بعد وہ ترقی پسند ادیبوں کی نئی تنظیم National Federation of Progressive Writers کے جنرل سکریٹری کے منصب پر فائز ہوئے اور میرا انتخاب سکریٹری کی حیثیت سے ہوا۔ دوسرے تنظیمی کاموں کے علاوہ دتی، جبلپور اور لکھنؤ کی کانفرنسوں میں ان کا ساتھ رہا۔ ہندستان کی مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کی اس تنظیم میں، سبھی ادیب بھیشم ساہنی کی عزت کرتے تھے اور انھیں ان کی قیادت پر اعتماد تھا۔ بھیشم جی کی شخصیت میں ایک ادبی تنظیم اور تحریک کی سربراہی کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ وہ نرم گفتار، ملنسار، شائستہ اور مہذب انسان تھے، ہر طرح اور ہر مزاج کے ادیبوں کو ساتھ لے کر چلنا جانتے تھے۔ ان کے معصوم سے چہرے پر ہمیشہ ایک مدھر سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی جو دشمنوں کا دل جیتنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ سوائے ایک موقع کے میں نے کبھی انھیں طیش یا غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ اس واقعے کا ذکر آگے آئے گا۔

بھیشم ساہنی ہندی کے ان ادیبوں میں تھے جو ایک واضح اور شفاف سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ اس معاملے میں ان کے دل میں کسی طرح کا تذبذب یا الجھاؤ نہیں تھا۔ ایک بار میں پروفیسر رئیس احمد مرحوم کے ساتھ پرتگال کی راجدھانی لسبن میں فلسطینیوں کی حمایت میں ہوئی ایک کانفرنس میں شرکت کر کے واپس آرہا تھا۔ ماسکو سے دوسری فلائٹ لینا تھی۔ ایئرپورٹ پر اچانک دیکھا کہ بھیشم جی تنہا بیٹھے ایک کتاب کے مطالعے میں غرق ہیں— میں ان کے پاس گیا۔ بہت تپاک اور محبت سے ملے۔ فلائٹ میں تین گھنٹے باقی تھے، یہ وقت ان کے ساتھ گزرا۔ اُس دن انھوں نے مجھے متحدہ ہندستان کے اُن ایام کی روداد سنائی جب وہ راولپنڈی میں اپنے آبائی گھر میں رہتے تھے— انھوں نے بتایا کہ ان کے بیشتر ہمسائے اور دوست مسلمان تھے۔ انھوں نے اردو کے ساتھ کچھ فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اُس دن وہ اچھے موڈ میں تھے۔ ہنس ہنس کر لڑکپن اور جوانی کے واقعات اور تجربات سنا رہے تھے۔ ان واقعات کا ذکر انھوں نے اپنی آپ بیتی "آج کے اتیت" میں بھی کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی اور دوسرے ترقی پسند اہلِ قلم سے ان کا تعارف آزادی کے قبل لاہور میں ہی ہو گیا تھا۔ اندر کمار گجرال صاحب بھی لاہور میں فیض صاحب سے ملے تھے۔ بعد میں ایک ترقی پسند شاعر اور دانشور کی حیثیت سے گجرال صاحب اور بھیشم جی فیض صاحب کے خاص قدر شناسوں میں شامل ہو گئے۔ اس کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ 1972 میں فیض احمد فیض نے اپنی زندگی کے ستر سال پورے کیے۔ اس زمانے میں وہ اپنے وطن میں معتوب تھے۔ چنانچہ گجرال صاحب کی تحریک پر ہندستان میں فیض کا ستر سالہ جشن منانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ بھیشم جی اور یہ خاکسار اس کے دو سکریٹری بنائے گئے۔ ہم لوگوں نے پورے ملک میں اچھے پیمانے پر فیض صاحب کا جشن منانے کا منصوبہ بنایا۔ بھوپال، لکھنؤ، علی آباد، ممبئی اور دہلی میں بڑے اہتمام سے جلسے اور مذاکرے ہوئے اور ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان تقریبات میں ادیبوں، اہلِ دانش اور فیض کے قدردانوں نے وسیع پیمانے پر نہایت جوش سے شرکت کی۔ میرا خیال ہے کہ کسی ہندستانی ادیب کا جشن ایسے تزک و احتشام سے نہیں منایا گیا اور اس میں بلاشبہ بھیشم ساہنی صاحب کی ذہنی اور عملی قیادت کا اہم حصہ رہا ہے۔ اگرچہ کچھ بڑے ادیبوں نے ان تقریبات کی کامیابی پر رشک و رقابت کا اظہار بھی کیا۔

اسی طرح 1986 میں ہندستان میں ترقی پسند ادبی تحریک اور تنظیم کا پچاس سالہ جشنِ زریں منانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ایک سال قبل 1985 میں سید عاشور کاظمی صاحب کی کوشش اور رہنمائی میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا جشن زریں بڑے اہتمام سے منایا گیا تھا۔ اس میں مقامی ادیبوں کے علاوہ ہندوپاکستان کے تقریباً بیس ممتاز ترقی پسند ادیبوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ یہ اجتماع لندن کی ادبی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تسلیم کیا گیا۔

چونکہ ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس اپریل 1936 میں لکھنؤ میں ہوئی تھی اس لیے جشن زریں کی تقریبات کے لیے بھی لکھنؤ کا انتخاب ہوا۔ کئی مہینے تک ہم لوگ تندہی سے اس کی تیاریوں میں لگے رہے۔ مختلف زبانوں کے

ہندستانی ادیبوں کے علاوہ پاکستان سے بھی ممتاز ترقی پسند ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی اور ان کے ایک وفد نے شرکت بھی کی۔ کانفرنس کامیاب رہی لیکن افسوس کہ اس میں کچھ نزاعی مسائل ایسے بھی آئے جو ادیبوں کے لیے تکدر اور بے دلی کا باعث ہوئے۔ مثلاً لکھنؤ میں کانفرنس کے جو منتظمین اور میزبان تھے ان سے ہم نے اردو کے جن ترقی پسند ادیبوں کو مدعو کرنے کی درخواست کی تھی، ان میں سے بہتوں کو نہیں بلایا گیا۔ کانفرنس کے اشتہارات اور بینر صرف ہندی میں تیار کرائے گئے (بعد میں ہمارے احتجاج پر ایک دو بینر اردو میں لگائے گئے۔) اسی طرح اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کی جو قرارداد ہم نے رام لال صاحب کی سربراہی میں تیار کی تھی، وہ بھی پیش نہ ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں بطور احتجاج اردو کے بیشتر ادیبوں نے شرکت سے انکار کر دیا اور اپنا ایک جلسہ ہوٹل کے ہال میں جہاں قیام تھا، کیا۔ اس بات کا علم جب بھیشم ساہنی کو ہوا تو وہ افتتاحی اجلاس شروع ہونے سے ذرا پہلے ہوٹل میں آئے اور ہمارے اس پروٹسٹ پر سخت غصہ اور برہمی کا اظہار کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ کچھ ہندی ادیبوں کے رویے سے اردو ادیبوں کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچی ہے۔ ان سے کچھ دیر مکالمہ رہا بعد میں ہم لوگ شرکت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں تو ہندی اور دوسری زبانوں کے ترقی پسند ادیب ہمیشہ اردو کی حمایت کرتے تھے لیکن کچھ ادیب جیسے یش پال، امرت لال ناگر اور پریم چند کے بیٹے امرت رائے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے حق میں نہیں تھے۔ بھیشم ساہنی یقیناً ان کے حامی نہیں تھے۔ اس لیے جبلپور کانفرنس میں جب میں نے اردو کے دستوری حقوق کی حمایت کے لیے قرارداد پیش کی تو یہ بھیشم ساہنی کی کوشش تھی کہ امرت رائے اور بعض دوسرے ادیب خاموش رہے اور قرارداد منظور ہو گئی۔ لیکن لکھنؤ کی گولڈن جبلی کانفرنس میں منظور نہ ہو سکی۔ اور اس کے بدلے میں سردار جعفری کی تجویز پر ایک لسانی کمیشن بنا دیا گیا۔ یعنی مسئلے کو ٹال دیا گیا۔

ترقی پسند تحریک کی سربراہی کے علاوہ بھیشم ساہنی کی ہمہ گیر مقبولیت کے دوسرے اسباب بھی تھے۔ اس میں ان کے شاہکار ناول "تمس" کے ٹی۔ وی سیریل کی بے مثل کامیابی کا حصہ بھی رہا۔ تقسیم ہند کے واقعے پر بے شک اردو، ہندی میں دوسرے ناول اور افسانے بھی لکھے گئے لیکن بھیشم جی چونکہ خود اس دریائے خوں سے گزرے تھے۔ اس لیے ان کے اس ناول میں واقعات کے استناد اور تاثر کی شدت نے خاص کیفیت پیدا کر دی تھی جسے ہدایت کار گووند نہلانی نے پوری سچائی، قوت اور ہنرمندی سے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح بھیشم جی کے کچھ ڈرامے مثلاً "کبیرا کھڑا بازار میں" سارے ملک میں بڑی کامیابی سے کھیلے گئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایک باکمال افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی کامیابی بے مثل ہے۔ وہ انسانی نفسیات اور انسانی رشتوں کو ایسے نازک اور لطیف ڈھنگ سے اپنے افسانے کے تار و پود اور کرداروں میں سموتے ہیں کہ قاری کا دل و دماغ انجانی بصیرت اور مسرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اور وہ انسانی درد مندی (Compassion) کے اس تجربے اور احساس میں شامل ہو جاتا ہے جو افسانہ نگار کا محرک اور مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک چھوٹی سی کہانی "بولتا لحاف" کو لیجیے۔ ایک سوداگر ایک سرائے میں رات گزارنے کے لیے جاتا ہے۔ لیکن وہاں جگہ نہیں، سرائے کا مالک ترس کھا کر اسے ایک اجاڑ کمرے میں جگہ دیتا اور سردی سے بچنے کے لیے ایک بوسیدہ لحاف دے دیتا ہے۔ لیکن مسافر کو ساری رات اس کمبل میں سے وہ غریب بچوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو ٹھنڈ سے کانپ رہے ہیں۔ مسافر ان آوازوں کی وجہ سے سو نہیں پاتا۔ صبح کو وہ سرائے کے مالک سے شکایت کرتا ہے۔ مالک حیران ہوتا ہے اور اس کباڑی سے اس کا سبب پوچھتا ہے جس سے اس نے پرانا لحاف خریدا تھا۔ کباڑی اس کا راز جانتا ہے۔ وہ سرائے کے مالک کو بتاتا ہے:

"ہاں، میں جانتا ہوں، آوازیں آتی تھیں۔ لیکن میں نے سوچا تم اپنی سرائے میں لے جاؤ گے تو آوازیں آنی بند ہو جائیں گی۔"

پھر کباڑی بولا — "یہ لحاف دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا تھا۔ اس میں وہ سکڑے ایک دوسرے سے چپٹے پڑے رہتے تھے۔ دونوں ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری میں رہتے تھے۔ ان کے ماں باپ انھیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے، پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ دونوں بچے جیسے تیسے اپنے دن بتا رہے تھے کہ ایک دن کوٹھری کا مالک پہنچ گیا۔ وہ ڈرانے دھمکانے اور کوٹھری کا کرایہ طلب کرنے لگا۔ اور پھر یہ لحاف بغل میں دبا لیا اور دونوں بچوں کو کوٹھری سے ڈھکیل کر باہر نکال دیا..... بچوں سے ان کا ایک آخری سہارا لحاف تو چھن گیا لیکن ان کی آوازیں لحاف کو چھوڑ نہیں پائیں۔"

انسانی دکھوں کے تئیں درد مندی کا یہ احساس ہی بھیشم ساہنی کے افسانوں کی جان ہے۔ یہ ہنر انھوں نے پریم چند اور روسی ادیب چیخوف دونوں سے سیکھا۔ وہ روسی زبان بھی جانتے تھے۔ انگریزی ادب خصوصاً فکشن پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ لیکن اپنے مختصر افسانوں میں انھوں نے جس طرح نشتریت پیدا کی وہ ہنر انھیں چیخوف سے ہی ہاتھ آیا۔ ان کے افسانے پڑھتے ہوئے مجھے اکثر چیخوف کے فن کے بارے میں گورکی کی یہ رائے یاد آتی ہے: "Chekhov has some thing larger than a world view. He has developed his Own idea of life and thus risen above it. He depicts its boredom, its absurdities and its strivings. The whole chaos of it from a higher point of view." *Soviet Literature-1980*

بھیشم ساہنی بھی اسی طرح کا زندگی کا ایک ارفع وژن رکھتے تھے جو ان کی کہانیوں میں دردمندانہ احساس سے معمور نظر آتا ہے۔ □□□

C-166, Vivek Vihar, Phase-1, Delhi-110 095

ترجمہ و ترتیب: فیروز عالم

تاثرات

سدھیش پچوری

بھیشم ساہنی بہت دنوں تک یاد آتے رہیں گے۔ وہ 'تھے' تو نہیں آتے تھے۔ جب تک جانے آنے لائق رہے، محفلوں اور سمیناروں میں اپنے مخصوص خوش مزاج لہجے کے ساتھ ملتے رہے۔ ان کا چہرہ ہم جیسے لوگوں کے لیے بڑا اپنا پن بھرا لگتا تھا۔ وہ کم بولتے تھے۔ ہاتھ ملاتے تو بڑا ہی نازک احساس جاگ اٹھتا تھا۔ چہرے پر بھلا پن لیے ہلکا سا تبسم ہوتا۔ وہ ملتے ہوئے ذرا جھک سے جاتے۔ آپ نہال ہو جاتے۔ یہ بڑپن تھا۔ تعلیم یافتہ معاشرے کی شرافت۔ گھمنڈ انھیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ ہر طرح سے شہری، پنجابی حسن، سر پر قرینے سے سنوارے گئے بال، جو پچھلے زمانے کے دلیپ کمار — ان کے بھائی بلراج ساہنی کے ہیئر اسٹائل کی یاد دلاتے۔ ناگار جن، کیدار ناتھ اگروال، جرلوچن اور شمشیر جیسے ہندی ادب کے نرم — سافٹ "سینئر سٹیزن" برتاؤ میں اپنی ٹیرینی کے لیے 'رف نف' نئی نسل انھیں بہت دنوں تک یاد کرے گی۔ بھیشم ایسی ہی ادبی تہذیب کے امین تھے۔ وہ ادب کے حقیقی اور مکمل 'شہری' تھے۔ میرا خیال ہے کہ پریم چند کی افسانوی روایت اگر شہری بن کر ابھرتی تو بھیشم کے روپ میں ہی ابھرتی۔

تحریکِ آزادی کی بچی کھچی مجسم تابناکی، صبر و تحمل، برداشت، نرم روی اور مضبوطی، تقسیم کے لامحدود تجربے، نہرو کا اثر، سماج واد کا حسین خواب، بڑے بھائی کے اتنے بڑے ہونے کی سادگی اور آخر میں سمت کے ساتھ سیکولر اقدار کے لیے عمر کے آخری دنوں میں بھی کندھے سے کندھا ملا کر سڑکوں پر اترنے کی دھیمی گتی (آہستہ رفتار) کے دھیرج کا نام ہے بھیشم ساہنی۔ وہ کچھوا چال سے چلتے۔ انھوں نے اپنے وقت کے کئی خرگوشوں کو کامیابی اور شخصیت میں آخرش پیچھے چھوڑا۔

وہ ہمارے دلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) میں انگریزی کے استاد رہے۔ اپنی نرم روی میں اٹوٹ۔ وہ بلراج ساہنی کے بھائی تھے، لیکن کبھی اسے جتاتے نہیں تھے۔ بلراج بھی کہاں اپنے ہیرو پن کو جتاتے تھے۔ یہ اپٹا اور ترقی پسند تحریک کا کلچر تھا جو بھیشم کی شخصیت کا حصہ تھا۔ کالج میں آپ محسوس ہی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ چھوٹا سا آدمی جو عادتاً اپنی دھیمی رفتار سے بغل سے گزرا ہے، ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ادیب ہے۔ وہ ہندی کی کلاسک "تمس" کا مصنف ہے، "چیف کی دعوت" کا مشہور تخلیق کار ہے اور جب "تمس" سیریل ہٹ ہوا تب معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان ایک ایسا فنکار ہے جو واقعی جینوئن اور اپنے عصر کا آدمی ہے اور اس میں زبردست تخلیقی صلاحیت ہے۔

وہ بڑے رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔ ان دنوں تو بڑے بڑے مصنف اپنے مفاد کے لیے کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں۔ ایسے میں بھیشم جی کا جانا، بڑپن کا جانا ہے، ہمدردیں کا جانا ہے، شرافت کا جانا ہے، لیکن 88 سال سے زیادہ کوئی کب جیتا ہے۔ وہ جتنے شانت جیے، اتنی ہی شانتی سے چلے گئے۔ وہ شاید اپنے ناٹک "ہانش" کے ہیومنزم اور منکسر المزاجی میں ہمیں دکھائی دیے، وہ "کبیرا کھڑا بازار میں" کے کبیر کی طرح نظر آئے، "گلیل کا کھیل" میں بچوں کے آنند میں ہمیں دکھے۔ لیکن وہ بہت دنوں تک ہمیں سچ مچ یاد آتے رہیں گے۔ ہم اچانک پکاریں گے: بھیشم جی کو بلانا چاہیے۔ ان کا یہاں ہونا ضروری ہے..... اور وہ نہیں ہوں گے۔ ہم مایوس ہوں گے۔ ان کی خوبیاں ہوں گی، جنھیں ہم کبھی اپنا نہ پائیں گے..... وہ گرتے ہوئے سے میں ٹھہرے ہوئے ادیب تھے۔ ان کی شخصیت کا ٹھہراؤ، استحکام اور بڑپن درس دیتا ہے۔ ایک بڑا ادیب یہی سب دے سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کتنا لے سکتے ہیں؟ ان کا جانا ایک ادبی تہذیب کا جانا ہے، ترقی پسند حلقے کے ایک گھر کا کھو جانا ہے۔ لیکن انھیں جانا ہی تھا۔ عمر تھی۔ وہ جانے کے بعد زیادہ یاد آئیں گے۔

راجندر یادو

ان کی سب سے بڑی طاقت دردمندی ہے۔ ان کی افسانوی دنیا جمہوری حس اور رحم دلی سے عبارت ہے۔ یوں تو بھیشم جی کہانی کار اور ڈرامہ نگار دونوں ہیں اور انھوں نے "ہانش" جیسے ناٹک بھی لکھے ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر کہانی کار ہیں۔ کہانیوں میں ان کی سب سے بڑی طاقت واقعات کو سمیٹنے سے کہیں زیادہ ڈرامائی پچویشن پر گرفت ہے۔ حالانکہ انھوں نے گاؤں اور قصبے کے موضوع پر "میا داس کی ماڑی" جیسے ناول بھی لکھے ہیں لیکن صحیح معنوں میں وہ متوسط طبقے کے شہری سماج کے تخلیق کار ہیں۔ اس طبقے کی

حدود ان کی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ پریم چند یا جے شنکر پرساد کی طرح اس سماج کے ہو کر نہیں لکھتے بلکہ ایک مہذب شہری کی طرح لکھتے تھے۔ بھیشم جی وسیع سماجی اقدار کے تئیں ذمے داری کی وجہ سے ایک بیدار آرٹسٹ بھی رہے ہیں۔

بھیشم ساہنی عام زندگی کے عظیم فسانہ گو تھے۔ وہ اپنے اوپر کسی قسم کا بوجھ لاد کر نہیں چلتے تھے۔ نہ نظریے کا، نہ ادبی کامیابیوں کا، نہ سینئریٹی کا، نہ بزرگیت کا اور نہ ہی سماجی تبدیلیوں کے لیے اپنی انتھک کوششوں کا۔ ان کی شخصیت بالکل شفاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کسی قسم کی چالاکی نہیں دکھائی دیتی۔ ہاں ہنرمندی ضرور ہے، مخالف صورتِ حال میں نارمل رہنے اور سب کے ساتھ چلنے کی۔ زندگی میں آرٹ، سیاست اور خاندان کے ایک فرد کے مختلف کرداروں میں کسی قسم کی مخالفت یا تناؤ نہیں آنے دیا۔ سب کچھ بالکل نارمل انداز میں کرتے رہے۔ ان میں نہ رونے کی عادت تھی اور نہ ہی کسی قسم کی شہادت کا احساس کہ اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود چیزوں کو بدل کیوں نہیں پا رہے ہیں۔ قارئین کو جتنی اپنائیت ان کی تخلیقات اور کرداروں سے ملتی تھی اتنے ہی اپنے بھیشم جی بھی لگتے تھے۔

ان کے موضوعات کافی وسیع تھے۔ گزشتہ صدی اور اس صدی کے بیچ کے پورے وقت کو انھوں نے تاریخ اور سماجیات سے پرے جاکر سمیٹا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں تقسیم کے دور کی زبردست عکاسی کی ہے۔ ایک سیاست داں اور تخلیق کار ہونے کے باوجود دونوں سے الگ ہٹ کر اور اوپر اٹھ کر عام آدمی نے جس طرح سے اس تقسیم کا سامنا کیا، اس کے پس منظر میں جو ایک طاقت تھی جس کے سہارے اس نے اپنے وقت کا سامنا کیا، اس کا بہت خوبصورت نقشہ ان کی تخلیقات میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ناول نگار اور کہانی کار کے طور پر زندگی کی جن حقیقتوں کو وہ اٹھاتے ہیں، وہ حقیقتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ اپنی طرح سے انھیں بیان کیا۔ انھوں نے اپنی شرطوں پر اپنے قد کو اونچا کیا۔ حالانکہ بھیشم جی کی آنکھ ایک شہری کی آنکھ ہے، چیزوں کو دیکھنے کا ان کا نظریہ بھی متوسط طبقے کا ہی ہے لیکن ان میں چھوٹے لوگوں کو پہچاننے کا مادّہ تھا۔

وشنو پربھاکر

میں نے مہذب، شائستہ اور نرم گفتار و کردار سے لبریز ایسی شخصیت نہیں دیکھی۔ نرالی شخصیت تھی ان کی۔ کافی ہاؤس میں بیوی کے ساتھ آتے تھے، بیوی کی موت کے بعد اکیلے ہوگئے۔ جب کبھی بیوی کے ساتھ بحث ہو جاتی تھی تو انھیں بڑے آرام سے سمجھاتے تھے۔ اپنے نقادوں سے بھی وہ کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ سبھی کے مشورے مان لیتے تھے۔ کوئی بھی بات بالکل پرسکون ہو کر سنتے تھے۔ "چیف کی دعوت"، "امرت سر آگیا"، "ان کی لازوال کہانیاں اور 'تمس' عدیم المثال ناول ہے۔ عظیم مصنف کے ساتھ ساتھ عظیم انسان ہونا بے حد مشکل ہے لیکن ان میں یہ دونوں خوبیاں ایک ساتھ ملتی ہیں۔

مہیپ سنگھ

بھیشم جی کی کچھ کہانیاں تو ناقابلِ فراموش ہیں۔ "چیف کی دعوت"، "اندر جال"، "امرت سر آگیا"، "چھپلا"، "او حرام زادے" جیسی کہانیاں شاید بھیشم ساہنی ہی لکھ سکتے تھے۔ تقسیم ملک کے سانحے پر اردو، ہندی، بنگالی اور پنجابی زبانوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ "تمس" اس المیے کے تیس سال بعد شائع ہوا۔ اس وقت اس ناول کو پڑھ کر ایسا لگا تھا کہ اتنے عرصے بعد بھی اس موضوع میں بڑی کشش ہے۔ "تمس" میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی، موضوع کے تئیں مصنف کی گہری سمجھ داری اور اس سے اپنائیت۔ "تمس" پانچ دنوں کی کہانی ہے لیکن ان پانچ دنوں کے پس منظر میں ہمیں بہت سارے دن، سال اور بہت ساری صدیاں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ نفرت، کینہ، فرقہ وارانہ جنون اور ان سے پیدا شدہ خیالات اور اعمال کی سفاکیت اس ملک میں کتنی صدیوں پہلے پنپی اور وقت وقت پر اپنا روپ بدل کر ننگا ناچتی رہی، "تمس" کی پانچ دنوں کی کہانی اس تاریخی پس منظر کو پوری طرح اُجاگر کرتی ہے۔

سعید مرزا

ہم جس مہذب اور متمدن ہندستان کی بات کرتے ہیں، بھیشم ساہنی اسی ہندستان کے سچے نمائندے تھے۔ مہذب، لبرل اور پوری طرح روشن خیال، ان کا چہرہ اپنے آپ میں ایک تاریخ تھا۔ ان کے چہرے پر اس ملک کی تاریخ درج تھی۔ ان کا چہرہ لگاتار دیتے چلے جا رہے عام ہندستانی کا نمائندہ تھا۔ "موہن جوشی حاضر ہو" میں موہن جوشی کے کردار کے لیے بھیشم جی کو چھوڑ کر دوسرا کوئی نام میرے دماغ میں نہیں آیا۔

(بشکریہ روزنامہ "ہندستان" نئی دہلی 13/جولائی 2003)

□□□

تحریر: بھیشم ساہنی
ترجمہ: خورشید عالم

وانگ چو

تبھی دور سے وانگ چو آتا دکھائی دیا۔

ندی کے کنارے لال منڈی کی سڑک پر دھیرے دھیرے ڈولتا سا چلا آرہا تھا۔ گیروے رنگ کا چغہ پہنے تھا اور دور سے لگتا تھا کہ بدھ بھکشوؤں کی طرح اس کا بھی سر منڈا ہوا ہے۔ پیچھے شنکر آچاریہ کی اونچی پہاڑی تھی اور اوپر شفاف نیلا آسمان۔ سڑک کے دونوں کنارے اونچے اونچے سفیدے کے پیڑوں کی قطاریں۔ پل بھر کے لیے مجھے لگا جیسے وانگ چو تاریخ کے صفحات سے اتر کر آگیا ہے۔ پرانے زمانے میں اسی طرح دیش بدیش سے آنے والے بدھ بھکشو پہاڑوں اور گھاٹیوں کو لانگھ کر بھارت میں آیا کرتے ہوں گے۔ ماضی کے ایسے ہی خوش رنگ دھندلکے میں وانگ چو بھی چلتا ہوا نظر آیا۔ جب سے وہ سری نگر آیا تھا، بدھ وہاروں کے کھنڈروں اور عجائب گھروں میں گھوم رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ لال منڈی کے عجائب گھر سے نکل کر آرہا تھا۔ جہاں بودھی عہد کے نوادرات رکھے ہیں۔ اس کی ذہنی کیفیت کو دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ وہ بیچ حال سے کٹ کر ماضی کے ہی کسی عہد گم گشتہ میں محو تھا۔

"بودھیوں سے ملاقات ہوگئی؟" پاس آنے پر میں نے چٹکی لی۔

وہ مسکرا دیا۔ ہلکی ٹیڑھی سی مسکان، جسے میری موسیری بہن ڈیڑھ دانت کی مسکان کہا کرتی تھی کیوں کہ مسکراتے وقت وانگ چو کا اوپری ہونٹ صرف ایک طرف سے تھوڑا سا اوپر کو اٹھتا تھا۔

"عجائب گھر کے باہر بہت سی مورتیاں رکھی ہیں، میں وہی دیکھتا رہا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ پھر وہ یکایک جذباتی ہو کر بولا، "ایک مورتی کے صرف پیر ہی پیر بچے ہیں۔"

میں نے سوچا، آگے کچھ کہے گا" لیکن وہ اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کا گلا رُندھ گیا اور اس کے لیے بولنا ناممکن ہو گیا۔

ہم ایک ساتھ گھر کی طرف لوٹنے لگے۔

"مہاپران کے بھی پیر ہی پہلے دکھائے جاتے تھے۔" اس نے کانپتی سی آواز میں کہا اور اپنا ہاتھ میری کہنی پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کی ہلکی سی تھرتھراہٹ دھڑکتے دل کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"شروع شروع میں مہاپران کی مورتیاں نہیں بنائی جاتی تھیں نا۔ تم تو جانتے ہو، پہلے استوپ کے نیچے صرف پاؤں ہی دکھائے جاتے تھے۔ مورتیاں تو بعد میں بنائی جانے لگی تھیں۔" ظاہر ہے بودھی کے پیر دیکھ کر اسے مہاپران کے پیر یاد آنے لگے تھے اور وہ جذباتی ہو اٹھا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سی بات کس وقت وانگ چو کو شاداں کر دے۔

"تم نے بہت دیر کر دی۔ کبھی لوگ تمھارا انتظار کر رہے تھے۔ میں چناروں کے نیچے بھی تمھیں کھوج آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں عجائب گھر میں تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن دو بجے تک ہمیں ہبا کدل پہنچ جانا چاہیے۔ ورنہ جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

اس نے چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کے ساتھ تین بار سر ہلایا اور قدم بڑھا دیے۔ وانگ چو بھارت میں متوالا بنا گھوم رہا تھا۔ وہ مہاپران کی جائے پیدائش لُمبنی کا سفر ننگے پاؤں کر چکا تھا۔ سارا راستہ ہاتھ جوڑے ہوئے، جس جس سمت میں مہاپران کے مبارک قدم اٹھے تھے — وانگ چو سحر زدہ سا اس سمت میں گھوم آیا تھا۔ سارناتھ میں کجہاں مہاپران نے اپنا پہلا وعظ کیا تھا اور ہرن کے دو بچے سحر زدہ سے جھاڑیوں میں سے نکل کر ان کی طرف دیکھتے رہ گئے تھے۔ وانگ چو گھنٹوں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے عقیدت سے سر شار بیٹھا تھا۔ یہاں تک کہ خود اس کے بقول اس کے لاشعور میں غیر واضح سے الفاظ گونجنے لگے تھے اور اسے لگا تھا جیسے مہاپران کا پہلا وعظ سن رہا ہے۔ وہ اس عبادت بھرے تصور میں اتنا گہرا ڈوب گیا تھا کہ سارناتھ میں ہی رہنے لگا تھا۔ گنگا کی دھارا کو وہ ہزاروں برس کے دھندلکے میں مقدس دریا کے روپ میں دیکھتا۔

جب سے سری نگر میں آیا تھا، برف سے ڈھکے پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اکثر مجھ سے کہتا "وہ راستہ لہاسا کو جاتا ہے نا! اسی راستے بدھ دھرم کی کتابیں چین بھیجی گئی تھیں۔" وہ ان پہاڑی سلسلوں کو متبرک مانتا تھا کیوں کہ ان پر بنی پگڈنڈیوں کے راستے بودھ بھکشو تبت کی طرف گئے تھے۔

وانگ چو کچھ عرصہ پہلے بدھ پروفیسر تان شان کے ساتھ بھارت آیا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ انھیں کے ساتھ رہا اور ہندی و انگریزی زبان سیکھتا رہا۔ پھر پروفیسر شان چین لوٹ گئے اور وہ یہیں رہ گیا۔ اور کسی بودھ سوسائٹی سے

گرانٹ حاصل کر کے سارناتھ میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ فطرت کی نیرنگیوں کا دلدادہ ایسا ذی روح جو ماضی کی دل کش تخیلاتی دنیا میں ہی عمر بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں حقیقت کی کھوج کرنے نہیں آیا تھا، وہ تو بودھیوں کی مورتیوں کو دیکھ کر شاداں ہونے آیا تھا۔ مہینے بھر سے عجائب گھروں کے چکر کاٹ رہا تھا، لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا کہ بدھ دھرم کی کس تعلیم سے اُسے سب سے زیادہ ترغیب ملتی ہے۔ نہ تو وہ کسی حقیقت کو پاکر خوشی سے کھل اٹھتا نہ اُسے کوئی تضاد پریشان کرتا۔ وہ بھگت زیادہ تھا اور متلاشی کم۔

مجھے یاد نہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ کبھی کھل کر بات کی ہو یا کسی موضوع پر اپنا خیال ظاہر کیا ہو۔ اُن دنوں میرے اور میرے دوستوں کے بیچ گھنٹوں بحثیں چلا کرتیں، کبھی ملکی سیاست کے بارے میں، کبھی مذہب کے بارے میں، لیکن وانگ چو ان میں کبھی حصہ نہ لیتا تھا۔ وہ سارا وقت دھیرے دھیرے مسکراتا رہتا، اور کمرے کے ایک کونے میں دُبک کر بیٹھا رہتا۔ ان دنوں ملک میں ولولوں کا سیلاب سا اُمڈ رہا تھا— آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور ہمارے بیچ اسی کا ذکر رہتا۔ کانگریس کون سی پالیسی اپنائے گی؟ تحریک کون سا رُخ پکڑے گی۔ عملی طور پر تو ہم لوگ کچھ کرتے کراتے نہیں تھے، لیکن جذباتی طور پر اس سے بہت کچھ جڑے ہوئے تھے۔ اس پر وانگ چو کی بے اعتنائی کبھی کبھی ہمیں کھلتی تو کبھی اچنبھے میں ڈال دیتی— وہ ہمارے ملک کے ہی نہیں، اپنے ملک کے حالات کے بارے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کے اپنے ملک کے بارے میں بھی پوچھو تو وہ مسکراتا سر ہلا تا رہتا تھا۔

کچھ دنوں سے سری نگر کی ہوا بھی بدلی ہوئی تھی۔ کچھ مہینے پہلے یہاں گولی چلی تھی۔ کشمیر کے لوگ مہاراجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اب کچھ دنوں سے شہر میں ایک نیا جوش پایا جاتا تھا۔ نہرو جی سری نگر آنے والے تھے اور ان کے استقبال کے لیے شہر کو دُلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ آج ہی دوپہر کو نہرو جی سری نگر پہنچ رہے تھے۔ ندی کے راستے ناؤوں کے جلوس کی شکل میں انھیں لانے کا پروگرام تھا اور اسی لیے میں وانگ چو کو تلاش کرتا ہوا اس طرف آنکلا تھا۔

ہم گھر کی طرف جا رہے تھے جب اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا میرا جانا بہت ضروری ہے...؟ جیسا تم کہو۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ ایسے وقت میں جب لاکھوں لوگ نہرو جی کے استقبال کے لیے اکٹھے ہو رہے تھے، وانگ چو کا یہ کہنا کہ اگر وہ ساتھ میں نہ جائے تو کیسا رہے، مجھے سچ مچ بُرا لگا، لیکن پھر خود ہی کچھ سوچ کر اس نے اپنا خیال بدل لیا اور ہم ساتھ ساتھ گھر کی طرف جانے لگے۔

کچھ دیر بعد ہم کدل کے پُل کے نزدیک لاکھوں کی بھیڑ میں ہم لوگ کھڑے تھے۔ میں، وانگ چو اور میرے دو تین دوست۔ چاروں طرف تاحدِ نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر، پُل پر، ندی کے ڈھلواں کناروں پر، میں بار بار کنکھیوں سے وانگ چو کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کا تاثر کیا ہے۔ ہمارے دلوں میں اٹھنے والے ولولوں کا اس پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ یوں بھی یہ میری عادت سی بن گئی ہے۔ جب بھی کوئی غیر ملکی ساتھ میں ہو، میں اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا کہ ہمارے رسم و رواج، ہمارے رہن سہن کے بارے میں اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں۔ وانگ چو ادھ مندی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھے جا رہا تھا۔ جب نہرو جی کی ناؤ سامنے آئی تو جیسے مکانوں کی چھتیں بھی دہل اٹھیں۔ راج ہنس کی شکل سی سفید ناؤ میں نہرو جی مقامی نیتاؤں کے ساتھ کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور ہوا میں پھول ہی پھول بکھر گئے۔ میں نے پلٹ کر وانگ چو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح بے نیاز سا سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو نہرو جی کیسے لگے؟" میرے ایک ساتھی نے وانگ چو سے پوچھا۔

وانگ چو نے اپنی ٹیڑھی سی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان کے ساتھ کہا— "اچھا، بہت اچھا۔"

وانگ چو معمولی سی ہندی اور انگریزی جانتا تھا۔ اگر تیز بولو تو اس کے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا۔

نہرو جی کی ناؤ دور جا چکی تھی، لیکن ناؤوں کا جلوس ابھی بھی چلتا جا رہا تھا۔ جب وانگ چو اچانک مجھ سے بولا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے عجائب گھر میں جانا چاہوں گا۔ ادھر سے راستہ جاتا ہے میں خود چلا جاؤں گا۔"

اور وہ بنا کچھ کہے ایک بار ادھ مندی آنکھوں سے مسکرایا اور ہلکے سے ہاتھ ہلا کر مڑ گیا۔

ہم سبھی حیران رہ گئے۔ اسے سچ مچ جلوس میں دلچسپی نہیں رہی ہو گی۔ جو اتنی جلدی عجائب گھر کی طرف اکیلا چل دیا ہے۔

"یار کس بوڑے کو اٹھا لائے ہو؟ یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے پکڑ لائے ہو اسے؟"

میرے ایک دوست نے کہا۔

"باہر کا رہنے والا ہے۔ اسے ہماری باتوں میں کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔" میں نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"واہ ملک میں اتنا کچھ ہو رہا ہے اور اسے دلچسپی ہی نہ ہو۔"

وانگ چو اب تک دور جا چکا تھا اور بھیڑ میں سے نکل کر پیڑوں کی قطاروں کے نیچے آنکھوں سے اوجھل ہو تا جا رہا تھا۔

"مگر یہ ہے کون؟" دوسرا ایک دوست بولا، "نہ یہ بولتا ہے، نہ چہکتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا، ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ سارا وقت ایک کونے میں دُبکا بیٹھا رہتا ہے۔"

"نہیں، نہیں بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ پچھلے پانچ سال سے یہاں رہ رہا ہے۔ کافی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ بدھ دھرم کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔" میں نے پھر اس کی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

میری نظر میں اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ وہ بودھ گرنتھ کی تلاوت کرتا ہے اور اسی کے لیے اتنی دور سے آیا ہے۔

"ارے بھاڑ میں جائے ایسی پڑھائی، واہ جی! جلوس کو چھوڑ کر میوزیم کی طرف چل دیا ہے۔"

"سیدھی بات ہے یار!" میں نے جوڑا، "اسے یہاں بھارت کا حال نہیں، ماضی کھینچ کر لایا ہے۔ ہیون سانگ بھی یہاں بودھ گرنتھ پڑھنے آیا تھا۔ یہ بھی علم کا رسیا ہے۔ بودھ دھرم میں اس کی دلچسپی ہے۔"

گھر لوٹتے ہوئے سارا راستہ ہم لوگ وانگ چو ہی کی چرچا کرتے رہے۔ اجے کا خیال تھا کہ اگر وہ پانچ سال بھارت میں کاٹ گیا ہے تو اب وہ ساری زندگی یہیں پر رہے گا۔

"اب آ گیا ہے تو لوٹ کر نہیں جائے گا۔ بھارت میں پردیسی ایک بار آ جائے تو لوٹنے کا نام نہیں لیتا۔"

"بھارت دیش وہ دلدل ہے کہ جس میں ایک بار باہر کے آدمی کا پاؤں پڑ جائے تو وہ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ نکلنا چاہے تو بھی نہیں نکلتا۔" دلیپ نے مذاق میں کہا، "نہ جانے کون سے کنول توڑنے کے لیے اس دلدل میں گھسا ہے۔"

"ہمارا ملک ہم ہندستانیوں کو پسند نہیں۔ باہر کے لوگوں کو تو بہت پسند ہے۔" میں نے کہا۔

"پسند کیوں نہ ہو گا۔ یہاں تھوڑے میں گزر ہو جاتی ہے۔ سارا دن دھوپ کھلی رہتی ہے۔ پھر باہر کے آدمی کو لوگ پریشان نہیں کرتے۔ جہاں بیٹھا ہے، وہیں بیٹھے رہنے دیتے ہیں۔ اس پر انھیں تم جیسے سادہ لوح بھی مل جاتے ہیں جو ان کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ تمھارا وانگ چو بھی یہیں پر مرے گا۔"

ہمارے یہاں ان دنوں میری چھوٹی موسیری بہن ٹھہری ہوئی تھی۔ وہی جو وانگ چو کی مُسکان کو ڈیڑھ دانت کی مُسکان کہا کرتی تھی۔ چلبلی سی لڑکی۔ بات بات پر شوخی کرتی رہتی تھی۔ میں نے وانگ چو کو دو ایک بار کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے پایا تھا۔ لیکن کوئی خاص دھیان نہیں دیا کیوں کہ وہ سبھی کو کنکھیوں سے ہی دیکھتا۔ لیکن اسی شام نیلم میرے پاس آئی اور بولی "آپ کے دوست نے مجھے تحفہ دیا ہے—پیار کا تحفہ۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا دیا ہے؟"

"جھومروں کا جوڑا۔"

اور اس نے دونوں مٹھیاں کھول دیں، جس میں چاندی کے کشمیری طرز کے دو سفید جھومر چمک رہے تھے اور وہ دونوں جھومر اپنے کانوں کے پاس لے جا کر بولی—"کیسے لگتے ہیں؟"

میں ہونقوں کی طرح نیلم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس کے اپنے کان کیسے بھورے بھورے ہیں؟" نیلم نے ہنس کر کہا۔

"کس کے؟"

"میرے اس پریمی کے۔"

"تمھیں اس کے بھورے کان پسند ہیں؟"

"بہت زیادہ۔ جب شرماتا ہے تو براؤن ہو جاتے ہیں، گہرے براؤن۔" اور نیلم کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

لڑکیاں کیسے اس آدمی کی محبت کا مذاق اڑا سکتی ہیں جو انھیں پسند نہ ہو۔ یا کہیں نیلم مجھے بنا تو نہیں رہی ہے؟

لیکن میں اس بات سے بہت فکر مند نہیں ہوا تھا۔ نیلم لاہور میں پڑھتی تھی اور وانگ چو سارناتھ میں رہتا تھا۔ اور اب وہ ہفتہ بھر میں سری نگر سے واپس لوٹ جانے والا تھا۔ اس محبت کی کونپل خود بخود جل جائے گی۔

"نیلم، یہ جھومر تو تم نے اس سے لیے ہیں لیکن اس قسم کی دوستی آخر میں اس کے لیے غم ناک ہو گی۔ بنے بنائے گی کچھ نہیں۔"

"واہ بھیّا، تم بھی کیسے دقیانوسی ہو۔ میں نے بھی چمڑے کا ایک رائٹنگ پیڈ اسے تحفے میں دیا ہے۔ میرے پاس پہلے سے پڑا تھا۔ میں نے اسے دے دیا۔ جب لوٹے گا تو پریم پتر لکھنے میں اُسے آسانی ہو گی۔"

"وہ کیا کہتا تھا۔"

"کہتا کیا تھا، سارا وقت اس کے ہاتھ کانپتے رہے اور چہرہ کبھی سرخ ہوتا، کبھی زرد۔ کہتا تھا مجھے خط لکھنا، میرے خطوں کا جواب دینا اور کیا کہے گا، بے چارہ بھورے کانوں والا۔"

میں نے غور سے نیلم کی طرف دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں مجھے ہنسی

کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیا۔ لڑکیاں دل کی بات چھپانا خوب جانتی ہیں۔ مجھے لگا، نیلم اسے بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس کے لیے یہ کھلواڑ تھا، لیکن وانگ چو ضرور اس کا دوسرا ہی معنی نکالے گا۔

اس کے بعد مجھے لگا کہ وانگ چو اپنا توازن کھو رہا ہے۔ اسی رات میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا باہر میدان میں چناروں کی قطار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب چاندنی میں، کچھ دوری پر پیڑوں کے نیچے مجھے وانگ چو ٹہلتا دکھائی دیا۔ وہ اکثر رات کو دیر تک پیڑوں کے نیچے ٹہلتا رہتا تھا۔ مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ نیلم بھی اس کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر چلتی جا رہی تھی۔ مجھے نیلم پر غصہ آیا۔ لڑکیاں کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کھلواڑ سے وانگ چو کی بے چینی بڑھے گی، وہ اسے بڑھاوا دیے جا رہی تھی۔

دوسرے روز کھانے کی میز پر نیلم پھر اس کے ساتھ مذاق کرنے لگی۔ کچن سے ایک چوڑا سا المونیم کا ڈبہ اٹھا لائی۔ اس کا چہرہ تپتے تانبے جیسا لال ہو رہا تھا۔

"آپ کے لیے روٹیاں اور آلو بنا لائی ہوں۔ آم کے اچار کی پھانک بھی رکھی ہے۔ آپ جانتے ہیں، پھانک کسے کہتے ہیں — ایک بار کہو تو پھانک! کہو وانگ چو جی، پھانک!"

اس نے نیلم کی طرف کھوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولا، "بانک"

ہم سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"بانک نہیں، پھانک!"

"بانک!" پھر ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

نیلم نے ڈبہ کھولا۔ اس میں سے آم کے اچار کا ٹکڑا نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولی، "یہ ہے پھانک — پھانک اسے کہتے ہیں۔" اور اسے وانگ چو کی ناک کے پاس لے جا کر بولی، "اسے سونگھنے پر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ آیا منہ میں پانی؟ اب کہو پھانک!"

"نیلم، کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ بیٹھو آرام سے۔" میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

نیلم بیٹھ گئی، لیکن اس کی شرارتیں بند نہیں ہوئیں۔ بڑے پیار سے وانگ چو سے کہنے لگی — بنارس جا کر ہمیں بھول نہیں جائیے گا۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو جھجکیے گا نہیں۔"

وانگ چو لفظوں کے معنی تو سمجھ لیتا تھا لیکن ان کے پیچھے چھپی تضحیک کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا۔

"بھیڑ کی کھال کی ضرورت ہو یا کوئی نمدہ یا اخروٹ۔"

"نیلم!"

"کیوں بھیا! بھیڑ کی کھال پر بیٹھ کر گرنتھ پڑھیں گے؟"

وانگ چو کے کان لال ہونے لگے۔ شاید پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا کہ نیلم مذاق کر رہی ہے۔ اس کے کان سچ مچ بھورے رنگ کے ہو رہے تھے، جس کا نیلم مذاق اڑایا کرتی تھی۔

"نیلم جی، آپ لوگوں نے میری بڑی مہمان نوازی کی ہے۔ میں بڑا ممنوں ہوں۔"

ہم سب چپ ہو گئے۔ نیلم بھی جھینپ سی گئی۔ وانگ چو نے ضرور ہی اس کی شرارت کو سمجھ لیا ہوگا۔ اس کے دل کو ضرور ٹھیس لگی ہوگی۔ لیکن میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے کہ نیلم کے تئیں اس کے خیالات بدلیں ورنہ اسے ہی سب سے زیادہ پریشانی ہوگی۔

شاید وانگ چو اپنی حیثیت کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایک دامِ فریب میں آ گیا تھا۔ جذباتی آدمی کا خود پر کوئی قابو نہیں ہوتا۔ وہ پچھاڑ کھا کر گرتا ہے تبھی اپنی بھول کو سمجھ پاتا ہے۔

ہفتہ کے آخری دنوں میں وہ روز کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آنے لگا۔ ایک بار میرے لیے بھی چغہ لے آیا اور بچوں کی طرح ضد کرنے لگا کہ وہ اور میں اپنا اپنا چغہ پہن کر ایک ساتھ گھومنے جائیں۔ عجائب گھر میں وہ اب بھی جاتا تھا۔ دو ایک بار نیلم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور لوٹنے پر ساری شام نیلم بودھیوں کا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ میں مَن ہی مَن نیلم کے اس رویے سے خوش ہوتا رہا۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وانگ چو کی کوئی خواہش، کوئی جذباتی وابستگی ہمارے گھر میں جڑ جما پائے۔ ہفتہ بیت گیا اور وانگ چو سارناتھ واپس لوٹ گیا۔

وانگ چو کے چلے جانے کے بعد اس کے ساتھ میرا تعلق ویسا ہی رہا جیسا عام طور پر ایک شناسا کے ساتھ رہتا ہے۔ گاہے بگاہے خط آ جاتا یا کسی آتے جاتے شخص سے اس کی خیر خبر مل جاتی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو برسوں تک رسمی جان پہچان کی سرحد پر کھڑے رہتے ہیں۔ نہ سرحد پھلانگ کر اندر آتے ہیں نہ ہی پیچھے ہٹ کر آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ مجھے اتنی ہی جانکاری رہی کہ اس کے روز و شب کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا — کچھ دنوں مجھے تجسس رہا کہ نیلم اور وانگ چو کے بیچ کی بات آگے بڑھی یا نہیں لیکن لگا کہ وہ پریم بھی وانگ چو کی سپاٹ زندگی پر حاوی نہیں رہ پایا۔

برس اور سال بیت گئے۔ ان دنوں ہمارے ملک میں بہت کچھ گھٹ رہا تھا۔ آئے دن تحریکیں ہوتیں، بنگال میں قحط پڑا۔ "بھارت چھوڑو" آندولن ہوا — سڑکوں پر گولیاں چلیں، بمبئی میں ملاحوں کی بغاوت ہوئی۔ دیش میں خونریزی ہوئی، پھر دیش کا بٹوارہ ہوا۔ لیکن سارا وقت وانگ چو سارناتھ ہی

میں رہا۔ وہ اپنے میں مطمئن لگتا تھا۔ کبھی لکھتا کہ "تنتر گیان" کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کبھی پتہ چلتا کہ کوئی کتاب لکھنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

اس کے بعد میری ملاقات وانگ چو سے دلّی میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب چین کے وزیر اعظم چو این لائی بھارت کے دورے پر آنے والے تھے۔ وانگ چو اچانک مجھے سڑک پر مل گیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ مجھے اچھا لگا کہ چین کے وزیر اعظم کی آمد پر وہ سارناتھ سے دہلی چلا آیا ہے، لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے وظیفے کے سلسلے میں آیا ہے اور یہ کہ یہاں پہنچنے پر اسے چو این لائی کی آمد کی خبر ملی ہے تو میں اس کی بے نیازی اور بدذوقی پر حیران ہوا۔ اس کا طور طریق ویسا کا ویسا ہی تھا۔ پہلے ہی کی طرح اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان مسکراتا رہا۔ کاروبار جہاں سے ویسا ہی بے نیاز، بے اعتنا، اس بیچ اس نے کوئی کتاب یا مقالہ وغیرہ نہیں لکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ "تنتر گیان" کے ذکر کے دوران بھی وہ پرسکون رہا۔ دو ایک کتابوں کے بارے میں بتاتا رہا جس میں وہ کچھ نوٹس لیتا رہا تھا۔ اپنے کسی مقالے کا بھی ذکر کیا، جس پر وہ ابھی کام کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ نیلم کے ساتھ اس کی خط وکتابت چلتی رہی۔ حالاں کہ نیلم کب کی بیاہی جاچکی تھی اور دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ہمارے خیالات بھلے نہ بدلیں لیکن ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اپنے مطالعہ وغیرہ کا بھی اس نے ذکر کیا۔ وہاں بھی اس کے شوق اور ولولے میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ پہلے جیسا جوش وجذبہ نہیں تھا۔ بودھیوں کے پیروں پر اپنی جان نچھاور کرتا نہیں پھرتا تھا، لیکن اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ پہلے ہی کی طرح تھوڑا کھاتا، تھوڑا پڑھتا، تھوڑا سیر کرتا اور تھوڑا سوتا تھا اور پھر دور لڑکپن کے جھٹپٹے میں اپنی زندگی کے لیے چنی گئی راہ پر کچھوے کی چال مزے سے چلتا آرہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہمارے بیچ بحث چھڑ گئی— "سماجی نظام کو سمجھے بنا تم بودھ دھرم کو بھی کیسے سمجھ پاؤگے؟ ہر علم ایک دوسرے سے جڑا ہے، زندگی سے جڑا ہے، کوئی چیز زندگی سے الگ نہیں ہے۔ تم زندگی سے الگ رہ کر دھرم کو کیسے سمجھ سکتے ہو؟"

کبھی وہ مسکراتا، کبھی سر ہلاتا اور سارا وقت نمائش جیتوں کی طرح میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے لگا کہ میرے کہنے کا اس پر کوئی اثر نہیں رہا کہ میں چکنے گھڑے پر پانی انڈیلے جا رہا ہوں۔

"ہمارے دیش میں نہ سہی، تم اپنے دیش کے حالات میں تو دلچسپی لو۔ اتنا تو جانو سمجھو کہ وہاں پر کیا ہو رہا ہے؟"

اس پر بھی وہ سر ہلاتا اور مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بھائی کو چھوڑ کر چین میں اس کا کوئی نہیں ہے—1919 میں وہاں پر کوئی سیاسی ہنگامہ ہوا تھا اس میں اس کا گاؤں جلا ڈالا گیا تھا اور سارے عزیز رشتے دار مر گئے تھے، یا بھاگ گئے تھے۔ لے دے کر اس کا ایک بھائی بچا تھا جو پیکنگ [بیجنگ] کے نزدیک کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ برسوں سے وانگ چو کا تعلق اس سے بھی ٹوٹ چکا تھا۔ وانگ چو پہلے اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھتا رہا تھا۔ بعد میں پیکنگ کے ایک اسکول میں پڑھنے لگا تھا۔ وہیں سے وہ پروفیسر شان کے ساتھ بھارت چلا آیا تھا۔

"سنو وانگ چو! بھارت اور چین کے درمیان بند دروازے اب کھل رہے ہیں۔ اب دونوں ملکوں کے بیچ تعلقات بحال ہو رہے ہیں اور اس کی بڑی اہمیت ہے۔ حصول علم کا یہی کام جو ابھی تک تم الگ تھلگ کرتے رہے ہو، اب تم اپنے دیش کے باضابطہ نمائندے کی حیثیت سے کروگے۔ تمھاری سرکار تمھارے وظیفے کا انتظام کرے گی۔ اب تمھیں الگ تھلگ نہیں رہنا پڑے گا۔ تم پندرہ سال سے بھی زیادہ عرصے سے بھارت میں ہو۔ انگریزی اور ہندی زبانیں جانتے ہو، بودھ گرنتھوں کا زبردست مطالعہ رکھتے ہو۔ تم دونوں ملکوں کے تہذیبی رشتے کو قائم کرنے میں ایک بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔"

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی۔ سچ مچ اسے کچھ سہولتیں مل سکتی تھیں۔ کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے؟ دونوں ملکوں کے بیچ خوش گوار تعلقات سے وہ بھی متاثر ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ ہی دنوں پہلے جب وظیفے کی رقم لینے بنارس میں گیا تو سڑکوں پر راہ چلتے لوگ اس سے گلے مل رہے تھے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے ضرور اپنے دیش لوٹ جائے اور وہاں ہونے والی بڑی بڑی تبدیلیوں کو دیکھے اور سمجھے کہ سارناتھ میں الگ تھلگ بیٹھے رہنے سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

وہ سنتا، سر ہلاتا اور مسکراتا رہا، لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہو پایا کہ اس پر کوئی اثر ہوا ہے یا نہیں۔

لگ بھگ چھ مہینے بعد اس کا خط آیا کہ وہ چین جا رہا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اپنے دیش میں جائے گا تو اس کی دھوبی کے کتے جیسی حالت تو ختم ہو جائے گی۔ کہیں کا تو ہو کر رہے گا۔ اس کی زندگی میں نئی توانائی آئے گی۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنا ایک ٹرنک سارناتھ میں چھوڑے جا رہا ہے، جس میں اس کی کچھ کتابیں اور زیر تحقیق مسودے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں، یہ کہ بھارت میں برسوں رہ چکنے کے بعد وہ اپنے کو بھارت کا باشندہ مانتا ہے اور یہ بھی کہ وہ

جلد ہی بھارت لوٹ آئے گا۔ میں اپنے من ہی من میں ہنس دیا۔ ایک بار اپنے دیش گیا تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔

چین میں وہ لگ بھگ دو برسوں تک رہا۔ وہاں سے اس نے مجھے پیکنگ کے قدیم راج محل کی تصویر بھیجی، دو ایک خط بھی لکھے۔ لیکن اس سے اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں کوئی خاص جانکاری نہیں ملی۔

ان دنوں چین میں بھی بڑے ولولے اٹھ رہے تھے۔ بڑا جوش تھا اور اس جوش کی لپیٹ میں تقریباً سبھی لوگ تھے۔ زندگی نئی کروٹ لے رہی تھی۔ لوگ کام کرنے جاتے تو ٹولیاں بنا کر گاتے ہوئے لال جھنڈے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے۔ وانگ چو سڑک کے کنارے کھڑا انھیں دیکھتا رہ جاتا۔ اپنی کم آمیز طبیعت کے باعث وہ ٹولیوں کے ساتھ گاتے ہوئے جا تو نہیں سکتا تھا، لیکن انھیں جاتے دیکھ کر حیران سا کھڑا رہ جاتا، جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

اسے اپنا بھائی تو نہیں ملا۔ لیکن ایک پرانا استاد، دور سے رشتے کی ایک خالہ اور دو ایک شناسا مل گئے تھے۔ وہ اپنے گاؤں گیا۔ گاؤں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اسٹیشن سے گھر جاتے ہوئے اس کا ایک ہم سفر بتانے لگا — وہاں اس پیڑ کے نیچے زمیندار کے سبھی کاغذ، سبھی دستاویز جلا ڈالے گئے اور زمیندار ہاتھ باندھے کھڑا رہا تھا۔

وانگ چو نے بچپن میں زمیندار کا بڑا گھر دیکھا تھا۔ اس کی رنگین کھڑکیاں اسے اب بھی یاد تھیں۔ دو ایک بار زمیندار کی بگھنی کو بھی قصبے کی سڑک پر جاتے دیکھا تھا — اب وہ گھر گاؤں کی انتظامیہ کا دفتر بنا ہوا تھا اور سبھی بہت کچھ بدلا تھا، لیکن یہاں بھی اس کے لیے ویسی ہی صورت حال تھی، جیسی بھارت میں رہی تھی۔ اس کے من میں کوئی ولولہ نہیں اٹھتا تھا، دوسروں کے جوش و جذبے اس کے دل پر سے پھسل پھسل جاتے تھے۔ وہ یہاں بھی تماشائی ہی بنا گھومتا رہتا تھا۔ شروع کے دنوں میں اس کی آؤ بھگت بھی ہوئی۔ اس کے پرانے استاد کی ایما پر اسے اسکول میں مدعو کیا گیا۔ بھارت چین تہذیبی رشتوں کے بیچ ایک بہت اہم کڑی قرار دے کر اسے اعزاز سے نوازا گیا۔ وہاں وانگ چو دیر تک لوگوں کو بھارت کے بارے میں بتاتا رہا۔ لوگوں نے طرح طرح کے سوالات پوچھے، رسم و رواج کے بارے میں، تیرتھوں، میلوں، تہواروں کے بارے میں۔ وانگ چو صرف ان سوالوں کا ٹھیک سے جواب دے پاتا، جن کے بارے میں وہ تجربے کی روشنی میں کچھ جانتا تھا۔ لیکن بہت کچھ ایسا تھا جس کے بارے میں وہ بھارت میں رہ کر بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

کچھ دنوں بعد چین میں، لمبی چھلانگ، کی مہم زور پکڑنے لگی۔ اس کے گاؤں میں بھی لوگ لوہا اکٹھا کر رہے تھے۔ ایک دن صبح اسے بھی ایک ٹولی کے ساتھ ردی لوہا بٹورنے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ دن بھر وہ لوگوں کے ساتھ تھا۔ ایک نیا جوش چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ لوگ بڑے فخر سے دکھا دکھا کر لا رہے تھے اور سامنے ڈھیر پر ڈال رہے تھے۔ رات کے وقت آگ کے لپلپاتے شعلوں کے درمیان اس کو پگھلایا جانے لگا۔ آگ کے ارد گرد بیٹھے لوگ انقلابی گیت گا رہے تھے۔ سبھی لوگ ایک آواز ہو کر گیت گا رہے تھے۔ اکیلا وانگ چو منہ بند کیے بیٹھا تھا۔

وہ چین ہی میں تھا کہ دھیرے دھیرے ماحول میں ایک تناؤ سا آنے لگا اور ایک جھٹپٹا سا گھرنے لگا۔ ایک روز ایک آدمی نیلے رنگ کا کوٹ اور نیلے ہی رنگ کی پتلون پہنے اس کے پاس آیا اور اسے اپنے ساتھ گاؤں کے انتظامیہ کے دفتر لے گیا۔ راستہ بھر وہ آدمی چپ چاپ رہا۔ دفتر پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ ایک بڑے سے کمرے میں پانچ آدمیوں کا ایک دفد میز کے پیچھے بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔

جب وانگ چو ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ باری باری اس سے بھارت میں قیام کے بارے میں پوچھنے لگے، تم بھارت میں کتنے برسوں تک رہے؟" ... "وہاں کیا کرتے تھے؟" ... "کہاں کہاں گھومے؟" وغیرہ وغیرہ۔ پھر بودھ دھرم کے بارے میں، وانگ چو کی دلچسپی کے بارے میں جان کر ان میں سے ایک شخص بولا۔ "تمھارے خیال میں بودھ دھرم کے بنیادی عقائد کی کیا کیا خصوصیات ہیں؟"

سوال وانگ چو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے آنکھیں مچمچائیں۔

"روحانی عقائد و خصوصیات کی رو سے تم بدھ دھرم کو کیسا مانتے ہو؟"

سوال پھر بھی وانگ چو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن اس نے بدبداتے ہوئے جواب دیا، "روحانیت میں مضمر "انسان کے ابدی سکون کے حصول کے لیے بدھ دھرم کے بتائے ہوئے راستے بہت اہم ہیں — مہاپران کا پیغام۔"

اور وانگ چو بودھ دھرم کے آٹھ اپدیشوں کو بیان کرنے لگا۔ وہ اپنی بات ابھی ختم بھی نہیں کر پایا تھا" جب پردھان کی کرسی پر بیٹھے کٹیلی ترچھی آنکھوں والے ایک شخص نے بات کاٹ کر کہا، "بھارت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

وانگ چو مسکرایا، اپنی ڈیڑھ دانت کی مسکان۔ پھر بولا، "آپ حضرات اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں تو ایک معمولی بدھ کا پیرو ہوں، لیکن بھارت بڑا قدیم دیش ہے۔ اس کی تہذیب، امن اور انسانیت کے تئیں نیک جذبوں کی تہذیب ہے۔"

"نہرو کے بارے میں تم کیا سوچتے ہو؟"

"نہرو کو میں نے تین بار دیکھا ہے۔ ایک بار تو ان سے باتیں بھی کی ہیں۔ ان پر کچھ کچھ مغربی تعلیم کا اثر زیادہ ہے، لیکن روایتی قدیم تہذیب کے وہ بھی بڑے حامی ہیں۔"

اس کے جواب سنتے ہوئے کچھ تو سر ہلانے لگے، کچھ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ پھر طرح طرح کے ٹیڑھے سوالات پوچھے جانے لگے۔ انھوں نے پایا کہ جہاں تک حقیقتوں اور بھارت کے موجودہ حالات کی جان کاری کا سوال ہے، وانگ چو کی معلومات ادھوری اور مضحکہ خیز ہیں۔

"سیاسی نقطہ نظر سے تو تم صفر ہو۔ بدھ دھرم کی تعلیمات کو بھی سماجی ضروریات کی تکمیل کے لحاظ سے تم نہیں ثابت کر سکتے۔ نہ جانے وہاں بیٹھے کیا کرتے رہے ہو۔ لیکن ہم تمھاری مدد کریں گے۔"

پوچھ تاچھ گھنٹوں چلتی رہی۔ پارٹی افسروں نے اسے ہندی پڑھانے کا کام دے دیا۔ ساتھ ہی پیکنگ کے ایک عجائب گھر میں ہفتہ میں دو دن کام کرنے کی اجازت دے دی۔

جب وانگ چو پارٹی دفتر سے لوٹا تو تھکا ہوا تھا۔ اس کا سر بھنا رہا تھا۔ اپنے دیش میں اس کا دل جم نہیں پایا تھا۔ آج وہ اور بھی زیادہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ چھت کے نیچے لیٹا تو اسے اچانک بھارت کی یاد ستانے لگی۔ اسے سارناتھ کی اپنی کوٹھری یاد آئی۔ جس میں وہ دن بھر صحیفوں کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ نیم کا گھنا پیڑ یاد آیا، جس کے نیچے بیٹھ کر کبھی کبھی ستایا کرتا تھا۔ یادوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ سارناتھ کی کینٹین کا باورچی یاد آیا، جو ہمیشہ پیار سے ملتا تھا۔ سدا ہاتھ جوڑ کر عقیدت سے "کہو بھگون" کہتا تھا۔

ایک بار وانگ چو بیمار پڑ گیا تھا، تو دوسرے روز باورچی اپنے آپ اس کی کوٹھری میں چلا آیا تھا۔ "میں بھی کہوں، چینی بابو چائے پینے نہیں آئے، دو دن ہو گئے، پہلے آتے تھے تو درشن ہو جاتے تھے۔ ہمیں خبر کی ہوتی بھگون، تو ہم ڈاکٹر بابو کو بلا لاتے... میں بھی کہوں بات کیا ہے۔" پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گنگا کا کنارہ آ گیا۔ جس پر وہ گھنٹوں گھوما کرتا تھا۔ پھر اچانک منظر بدلا اور کشمیر کی جھیل سامنے آ گئی اور پیچھے برف سے ڈھکے پہاڑ۔ پھر نیلم سامنے آئی۔ اس کی کھلی کھلی آنکھیں موتیوں سے جھلملاتے دانت... اس کا دل بے چین ہو اٹھا۔

جوں جوں دن بیتنے لگے، بھارت کی یاد اُسے زیادہ پریشان کرنے لگی۔ وہ مچھلی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ سارناتھ میں سوال و جواب نہیں ہوتے تھے، جہاں پڑے رہو، پڑے رہو، رہنے کے لیے کوٹھری اور کھانے کے لیے کھانے کا انتظام عبادت خانے کی طرف سے تھا۔ یہاں نئے نظریے سے مذہبی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا اور خواہش بھی نہ تھی۔ برسوں تک ایک ہی ڈھرّے پر چلتے رہنے کے باعث وہ تبدیلیوں سے کتراتا تھا۔ اس بیٹھک کے بعد وہ پھر سے اپنے آپ میں سمٹنے لگا تھا۔ کہیں کہیں اسے بھارت سرکار کے خلاف باتیں بھی سننے کو ملتیں۔ اچانک وانگ چو خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگا اور اسے لگا کہ زندہ رہ پانے کے لیے اُسے اپنے لڑکپن کے اس غیر شرمندۂ تعبیر خواب میں پھر سے لوٹ جانا ہوگا، جب وہ بودھ بھکشو بن کر بھارت میں عمر بسر کرنے کا تصور کیا کرتا تھا۔

اچانک اس نے بھارت لوٹنے کی ٹھان لی۔ لوٹنا آسان نہیں تھا۔ بھارتیہ سفارت خانے سے تو ویزا ملنے میں پریشانی نہیں ہوئی، لیکن چین سرکار نے بہت سے اعتراض کیے۔ وانگ چو کی شہریت کا سوال تھا اور بہت سے سوال تھے لیکن بھارت اور چین کے تعلقات ابھی تک بہت بگڑے نہیں تھے۔ اس لیے آخر میں وانگ چو کو بھارت لوٹنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے من ہی من فیصلہ کر لیا کہ وہ بھارت ہی میں اب زندگی کے دن کاٹے گا۔ بودھ بھکشو بنے رہنا ہی اس کا مقصدِ حیات تھا۔

جس روز وہ کلکتہ پہنچا، اسی روز سرحد پر چینی اور بھارتیہ فوجوں کے درمیان مڈبھیڑ ہوئی تھی اور دس بھارتیہ سپاہی مارے گئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسٹیشن کے باہر ابھی نکلا ہی تھا کہ دو سپاہی آ کر اُسے پولیس کے دفتر میں لے گئے اور وہاں ایک افسر گھنٹہ بھر اس کے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کی چھان بین کرتا رہا۔

"دو برس پہلے آپ چین گئے تھے۔ وہاں جانے کا مقصد کیا تھا؟"

"میں بہت برس تک یہاں رہتا رہا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے اپنے دیش جانا چاہتا تھا۔" پولیس افسر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وانگ چو بے فکر تھا اور مسکرا رہا تھا — وہی ٹیڑھی سی مسکان۔

"آپ وہاں کیا کرتے رہے؟"

"وہاں ایک کمیون میں کھیتی باڑی کی ٹولی میں کام کرتا تھا۔"

"مگر آپ تو کہتے ہیں کہ بودھ گرنتھ پڑھتے ہیں۔"

"ہاں، پیکنگ میں ایک ادارہ میں میں ہندی پڑھانے لگا تھا اور پیکنگ میوزیم میں مجھے کام کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔"

"اگر اجازت مل گئی تھی تو آپ اپنے دیش سے بھاگ کیوں آئے؟" پولیس افسر نے غصّے میں کہا۔

وانگ چو کیا جواب دے، کیا کہے؟

"میں کچھ دنوں کے لیے ہی وہاں گیا تھا، اب لوٹ آیا ہوں۔"

پولیس افسر نے پھر اسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شک ابھر آیا تھا۔ وانگ چو گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ بھارت میں پولیس افسروں کے سامنے کھڑا ہونے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے ضمانت کے لیے پوچھا گیا تو اس نے پروفیسر تان شان کا نام لیا۔ پھر گرودیو کا، لیکن دونوں مر چکے تھے، اس نے سارناتھ کے ادارے کے منتظم کا نام لیا، شانتی نکیتن کے دو ایک پرانے مددگاروں کے نام لیے، جو اسے یاد تھے۔

سپرنٹنڈنٹ نے سبھی نام اور پتے نوٹ کر لیے۔ اس کے کپڑوں کی تین بار تلاشی لی گئی۔ اس کی ڈائری کو رکھ لیا گیا۔ جس میں اس نے بہت سے اقتباسات، ریمارکس لکھ رکھے تھے اور سپرنٹنڈنٹ نے اس کے نام کے آگے ریمارکس لکھ دیے کہ اس آدمی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

ریل کے ڈبے میں بیٹھا تو دوسرے مسافر سرحد پر ہوئی جھڑپ کی باتیں کر رہے تھے۔ اُسے بیٹھتے دیکھ کر سب چپ ہو گئے اور اسے گھورنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب مسافروں نے دیکھا کہ وہ تھوڑی بہت بنگالی اور ہندی بول لیتا ہے تو ایک بنگالی بابو اُچک کر کھڑے ہوئے اور ہاتھ جھٹک جھٹک کر کہنے لگے، "یا تو کہو تمھارے دیش والوں نے وشواس گھات کیا ہے نہیں تو ہمارے دیش سے نکل جاؤ... نکل جاؤ... نکل جاؤ۔"

ڈیڑھ دانت کی مسکان جانے کہاں اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ چہرے پر خوف اتر آیا تھا۔ لاواس اور خوفزدہ وانگ چو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کہے بھی تو کیا کہے؟ جھڑپ کے بارے میں سن کر اُسے بھی تو دھچکا لگا تھا۔ اس جھگڑے کے سبب کے بارے میں اسے واضح طور پر کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور وہ جاننا چاہتا بھی نہیں تھا۔

ہاں سارناتھ پہنچ کر وہ سچ مچ مسرور ہو اٹھا۔ اپنا تھیلا رکشہ میں رکھے جب وہ آشرم کے نزدیک پہنچا تو کینٹین کا باورچی بچ بچ لپک کر باہر نکل آیا— "آ گئے بھگوان؟ آ گئے میرے چینی بابو؟ بہت دن بعد درشن دیے۔ ہم بھی کہیں، اتنا عرصہ ہو گیا چینی بابو نہیں لوٹے؟ اور کہیے سب خیر خیریت ہے؟ آپ یہاں نہیں تھے۔ ہم کہیں جانے کب لوٹیں گے؟ یہاں تھے تو دن میں دو باتیں ہو جاتی تھیں۔ بھلے آدمی کے درشن ہو جاتے تھے۔ اس میں بڑا سکون ملتا ہے اور اس نے ہاتھ بڑھا کر تھیلا اٹھا لیا۔ ہم دیں پیسے چینی بابو؟" وانگ چو کو لگا جیسے وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔

"آپ کا ٹرنک چینی بابو، ہمارے پاس رکھا ہے۔ منتری جی سے ہم نے لے لیا۔ آپ کی کوٹھری میں ایک دوسرے صاحب رہنے آئے تو ہم نے کہا، کوئی چنتا نہیں، یہ ٹرنک ہمارے پاس رکھ جائیے۔ اور چینی بابو آپ اپنا لوٹا باہر ہی بھول گئے تھے، ہم نے منتری جی سے کہا، "یہ لوٹا چینی بابو کا ہے، ہم جانتے ہیں، ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

وانگ چو کا دل بھر آیا۔ اسے لگا اس کی ڈانواڈول زندگی میں پھر سے توازن آ گیا ہے۔ زندگی کی ڈگمگاتی ناؤ پھر سے خاموشی سے چلنے لگی ہے۔

منتری جی بھی خلوص سے ملے۔ پرانے جان پہچان کے آدمی تھے۔ انھوں نے ایک کوٹھری بھی کھول کر دے دی لیکن وظیفہ کے بارے میں کہا کہ اس کے لیے پھر سے کوشش کرنی ہوگی۔ وانگ چو نے پھر سے کوٹھری کے بیچوں بیچ چٹائی بچھائی۔ کھڑکی کے باہر وہی منظر پھر سے ابھر آیا۔ کھویا ہوا ذی روح پھر سے اپنے مسکن کو لوٹ آیا۔

تبھی مجھے اس کا خط ملا کہ وہ بھارت لوٹ آیا ہے اور پھر سے جم کر بودھی صحیفوں کا مطالعہ کرنے لگا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ماہانہ وظیفے کے بارے میں تھوڑی تشویش ہے اور اس سلسلے میں اگر میں بنارس میں فلاں صاحب کو خط لکھ دوں تو وظیفہ ملنے میں سہولت ہوگی۔

خط پا کر مجھے کھٹکا ہوا۔ کون سا سراب اسے پھر سے واپس کھینچ لایا ہے۔ یہ لوٹ کیوں آیا ہے۔ اگر کچھ دن اور وہاں رہتا تو اپنے لوگوں کے درمیان اس کا من لگنے لگتا۔ لیکن کسی کی سنک کا کوئی علاج نہیں۔ اب جو لوٹ آیا ہے تو کیا چارہ ہے۔ میں نے "فلاں صاحب" کو خط لکھ دیا اور وانگ چو کے چھوٹے موٹے وظیفے کا انتظام ہو گیا۔

لیکن وانگ چو کے لوٹنے کے تقریباً دس روز بعد ایک دن صبح وہ چٹائی پر بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا کہ اس کی کتاب پر کسی کا سایہ پڑا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو پولیس کا تھانیدار کھڑا تھا، ہاتھ میں ایک پرچی لیے ہوئے۔ وانگ چو کا دل بیٹھ گیا۔ اب یہ کون سی نئی پریشانی اٹھنے والی ہے۔ وانگ چو بنارس کے بڑے پولیس اسٹیشن پر بلایا گیا تھا۔ وانگ چو کا من وسوسوں سے بھر اٹھا تھا۔

تین دن بعد وانگ چو بنارس کے پولیس اسٹیشن کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بینچ پر ایک اور ضعیف العمر چینی بھی بیٹھا تھا جو جوتے بنانے کا کام کرتا تھا۔ آخر بلاوا آیا اور وانگ چو چق اٹھا کر بڑے افسروں کی میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تم چین سے کب لوٹے؟"

وانگ چو نے بتا دیا۔

کلکتہ میں تم نے اپنے بیان میں کہا کہ تم شانتی نکیتن جا رہے ہو، پھر تم یہاں کیوں چلے آئے ہو؟ پولیس کو پتہ لگانے میں بڑی پریشانی ہوئی ہے۔"

"میں نے دونوں جملوں کے بارے میں کہا تھا۔ شانتی نکیتن تو میں صرف دو دن کے لیے جانا چاہتا تھا۔"

"تم چین سے کیوں لوٹ آئے؟"

"میں بھارت میں رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے پہلے کا جواب دہرایا۔

"جب لوٹ آنا تھا تو گئے کیوں تھے؟"

یہ سوال وہ بہت بار پہلے بھی سن چکا تھا۔ جواب میں بودھ گُرنتھوں کا حوالہ دینے کے علاوہ اُسے اور کوئی جواب نہیں سوجھ پاتا تھا۔

بہت لمبا انٹرویو نہیں ہوا۔ وانگ چو کو ہدایت دی گئی کہ ہر مہینے کے پہلے سوموار کو بنارس کے پولیس اسٹیشن میں اسے آنا ہوگا اور اپنی حاضری لکھوانی ہوگی۔

وانگ چو باہر آگیا لیکن اُلجھن سی محسوس کرنے لگا۔ مہینے میں ایک بار آنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ اس کی سپاٹ زندگی میں رکاوٹ تھی، خلل تھا۔

وانگ چو من ہی مَن اتنی اُلجھن محسوس کر رہا تھا کہ بنارس سے لوٹنے کے بعد کوٹھری میں جانے کے بجائے وہ سب سے پہلے اس مقدس جگہ پر جا کر بیٹھ گیا جہاں صدیوں پہلے مہاپران نے اپنا پہلا وعظ کیا تھا اور دیر تک بیٹھا ورد کرتا رہا۔ بہت دیر بعد پھر سے اس کا مَن بھٹکانے پر آنے لگا اور دل میں پھر سے بھاونا کی ترنگیں اٹھنے لگیں۔

لیکن وانگ چو کو چین نصیب نہیں ہوا۔ کچھ ہی دن بعد اچانک چین اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ گئی... دیش بھر میں جیسے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی روز شام کو کچھ پولیس والے جیپ میں آئے اور وانگ چو کو حراست میں لے کر بنارس چلے گئے۔ سرکار یہ نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟ حکومت چلانے والوں کو اتنی فرصت کہاں کہ بحران کے وقت دشمن کے ایک شہری کی حالت کی جانچ کرتے پھریں۔

دو دن تک دونوں چینیوں کو پولیس اسٹیشن کی ایک کوٹھری میں رکھا گیا۔ دونوں کے بیچ کسی بات میں یکسانیت نہیں تھی۔ جوتے بنانے والا چینی سارا دن سگریٹ پھونکتا رہتا اور گھٹنوں پر کہنیاں لگائے بڑبڑاتا رہتا۔ جب کہ وانگ چو مغموم و نڈھال سا دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا خلا میں دیکھتا رہتا۔

جس وقت وانگ چو اپنی حالت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اسی وقت دو تین کمرے چھوڑ کر پولیس سپرنٹنڈنٹ کی میز پر اس کی چھوٹی سی پوٹلی کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں پولیس کے سپاہی کوٹھری میں سے اس کا ٹرنک اٹھا لائے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کے سامنے کاغذوں کا پلندہ رکھا تھا جس پر کہیں پالی میں تو کہیں سنسکرت زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا لیکن بہت سا حصہ چینی زبان میں تھا۔ صاحب کچھ دیر تک تو کاغذوں کو الٹتے پلٹتے رہے، روشنی کے سامنے رکھ کر ان میں لکھی کسی خفیہ زبان کو ڈھونڈتے بھی رہے۔ آخر میں انھوں نے حکم دیا کہ کاغذ کے پلندے کو باندھ کر دہلی کے افسروں کے پاس بھیج دیا جائے کیوں کہ بنارس میں کوئی آدمی چینی زبان نہیں جانتا تھا۔

پانچویں دن لڑائی بند ہو گئی لیکن وانگ چو کو سارا تھوک لوٹنے کی اجازت ایک مہینے کے بعد ملی۔ چلتے وقت جب اسے اس کا ٹرنک دیا گیا اور اس نے اسے کھول کر دیکھا تو سکتے میں آگیا۔ اس کے کاغذات اس میں نہیں تھے۔ جن پر وہ برسوں سے اپنے نوٹس اور مضامین وغیرہ لکھتا رہتا تھا اور جو ایک طرح سے اس کا اثاثہ تھے۔ پولیس افسر کے کہنے پر انھیں دہلی بھیج دیا گیا ہے، وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا تھا۔

"میرے وہ کاغذات آپ مجھے دے دیجیے۔ ان پر میں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ بہت ضروری ہیں۔"

اس پر وہ افسر رُکھائی سے بولا "مجھے ان کاغذوں کا کیا کرنا ہے۔ آپ کے ہیں آپ کو مل جائیں گے، اور اس نے وانگ چو کو چلتا کیا۔ وانگ چو اپنی کوٹھری میں لوٹ آیا۔ اپنے کاغذوں کے بنا وہ ادھورا سا ہو رہا تھا۔ نہ پڑھنے میں مَن لگتا، نہ کاغذ پر نئے نوٹس اتارنے میں۔ اور پھر اس پر کڑی نگرانی رکھی جانے لگی تھی۔ کھڑکی سے تھوڑا ہٹ کر نیم کے پیڑ کے نیچے ایک آدمی روز بیٹھا نظر آنے لگا۔ ڈنڈا ہاتھ میں لیے وہ کبھی ایک کروٹ بیٹھتا، کبھی دوسری کروٹ۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا، کبھی کنویں کے چبوترے پر جا بیٹھتا۔ کبھی کینٹین کی بینچ پر آبیٹھتا، کبھی گیٹ پر جا کھڑا ہوتا۔ اس کے علاوہ اب وانگ چو کو مہینے میں ایک بار کی بجائے ہفتے میں ایک بار بنارس میں حاضری لگوانے جانا پڑتا تھا۔

تبھی مجھے وانگ چو کی چٹھی ملی۔ ساری تفصیل لکھنے کے بعد اس نے لکھا کہ بودھ وہار کا منتری بدل گیا ہے اور نئے منتری کو چین سے نفرت ہے اور وانگ چو کو ڈر ہے کہ وظیفہ ملنا بند ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ میں جیسے بھی ہو اس کے کاغذوں کو بچالوں، جیسے بھی بن پڑے، انھیں پولیس کے ہاتھوں سے نکلوا کر سارناتھ اس کے پاس بھجوا دوں۔ اور اگر بنارس کے پولیس اسٹیشن میں ہر ہفتے کی بجائے اُسے مہینے میں ایک بار جانا پڑے تو سہولت ہو گی۔ کیوں کہ اس طرح مہینے میں لگ بھگ دس روپے آنے جانے میں لگ جاتے ہیں۔ اور پھر کام میں مَن ہی نہیں لگتا۔ سر پر تلوار لٹکتی رہتی ہے۔

وانگ چو نے خط تو لکھ دیا لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ مجھ جیسے آدمی سے یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ یہاں کوئی کام بنا جان پہچان اور سفارش کے نہیں ہو سکتا اور میری جان پہچان کا بڑے سے بڑا آدمی میرے کالج کا پرنسپل تھا۔

پھر میں چند ایک ممبر پارلیمنٹ کے پاس گیا۔ ایک نے دوسرے کے پاس، دوسرے نے تیسرے کے پاس بھیجا۔ میں بھٹک بھٹک کر لوٹ آیا۔ تسلیاں تو بہت ملیں لیکن سب یہی پوچھتے — یہ چین جو گیا تھا، وہاں سے لوٹ کیوں آیا۔ یا پھر پوچھتا — پچھلے بیس سال سے مطالعہ ہی کر رہا ہے؟

لیکن جب میں اس کے مسودے کا ذکر کرتا تو سب یہی کہتے — ہاں، یہ تو ضائع نہیں ہونا چاہیے اور سامنے رکھے کاغذ پر کچھ نوٹ کر لیتے۔ اس طرح کی تسلی مجھے بہت ملی۔ سبھی سامنے رکھے کاغذ پر میری بات نوٹ کر لیتے۔ لیکن سرکاری کام کے راستے چکرویوہ کے راستوں جیسے ہوتے ہیں اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی آدمی تمھیں تمھاری حیثیت کا احساس کراتا رہتا ہے۔ میں نے جواب میں اس سے اپنی ساری کوششوں کا ذکر کیا۔ یہ بھی یقین دلایا کہ میں پھر سے لوگوں سے ملوں گا، ساتھ ہی میں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں تو وہ اپنے دیش لوٹ جائے کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔

خط سے اس کے دل کی کیفیت کیا ہوئی، میں نہیں جانتا۔ اس نے کیا سوچا ہوگا۔ لیکن ان تناؤ کے دنوں میں جب مجھے خود چین کے رویے پر غصہ آرہا تھا۔ میں وانگ چو کی مجبوریوں کو بہت ہمدردی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کا پھر ایک خط آیا۔ اس میں چین لوٹ جانے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف وظیفے کا ذکر کیا گیا تھا۔ وظیفے کی رقم اب بھی چالیس روپے ہی تھی۔ لیکن اسے پہلے اطلاع دی گئی تھی کہ سال ختم ہونے پر اس پر پھر سے غور کیا جائے گا کہ وہ ملتا رہے گا یا بند ہو جائے گا۔

لگ بھگ سال بھر بعد وانگ چو کو ایک پرزہ ملا کہ تمھارے کاغذات واپس کیے جاسکتے ہیں اور یہ کہ تم پولیس اسٹیشن آکر انھیں لے جاسکتے ہو۔ ان دنوں وہ بیمار پڑا ہوا تھا لیکن بیماری کی حالت میں بھی وہ گرتا پڑتا بنارس پہنچا، لیکن اس کے ہاتھ ایک تہائی کاغذ لگے — پوٹلی اب بھی ادھ کھلی تھی۔ وانگ چو کو پہلے تو یقین نہیں آیا۔ پھر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اس پر تھانیدار رُکھائی سے بولا، "ہم کچھ نہیں جانتے — انھیں اٹھاؤ اور لے جاؤ ورنہ ادھر لکھ دو کہ ہم لینے سے انکار کرتے ہیں۔"

کانپتی ٹانگوں سے وانگ چو پلندہ بغل میں دبائے لوٹ آیا۔ کاغذوں میں صرف ایک پورا مضمون اور کچھ نوٹس بچے تھے۔ اسی دن سے وانگ چو کی آنکھوں کے سامنے دھول اڑنے لگی تھی۔

وانگ چو کی موت کی خبر مجھے مہینے بھر بعد ملی۔ وہ بھی بودھ وہار کے منتری کی طرف سے کہ مرنے سے پہلے وانگ چو نے وصیت کی تھی کہ اس کا چھوٹا سا ٹرنک اور گنی چنی کتابیں مجھے پہنچا دی جائیں۔

عمر کے اس حصے میں پہنچ کر انسان بری خبریں سننے کا عادی ہو جاتا ہے اور ایسی خبریں دل پر گہرا زخم نہیں لگاتیں۔

میں فوراً تو سارنا تھ نہیں جا پایا۔ جانے کی کوئی تک بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ وہاں وانگ چو کا کون بیٹھا تھا جس سے اظہار تعزیت کرتا۔ وہاں تو صرف ٹرنک ہی رکھا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد موقع ملنے پر میں گیا۔ منتری جی نے وانگ چو کے لیے تعزیتی کلمات کہے۔ بڑا نیک دل آدمی تھا، صحیح معنوں میں بودھ بھکشو تھا، وغیرہ وغیرہ۔ میرے دستخط لے کر انھوں نے ٹرنک میرے حوالے کیا۔ ٹرنک میں وانگ چو کے کپڑے تھے، پھٹا پرانا چغہ تھا، جو کسی زمانے میں اس نے سری نگر سے خریدا تھا۔ چھوٹا سا کام دار چمڑے کا پیڈ تھا جو نیلم نے اسے تحفتاً دیا تھا۔ تین چار کتابیں تھیں، پالی کی اور سنسکرت کی۔ چٹھیاں تھیں، جن میں کچھ چٹھیاں میری، کچھ نیلم کی رہی ہوں گی، کچھ اور لوگوں کی۔

ٹرنک اٹھائے میں باہر کی طرف جا رہا تھا، جب مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ ملی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کینٹین کا باورچی بھاگا چلا آرہا تھا۔ اپنے خطوں میں اکثر وانگ چو اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔

"بابو آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ میرے ساتھ آپ کی بہت چرچا کرتے تھے۔ بہت بھلے آدمی تھے۔"

اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ سارے سنسار میں شاید یہی اکیلا ذی روح تھا، جس نے وانگ چو کی موت پر دو آنسو بہائے تھے — "بڑی بھولی طبیعت تھی۔ بے چارے کو پولیس والوں نے بہت پریشان کیا۔ شروع شروع میں تو چوبیس گھنٹے کی نگرانی رہتی تھی۔ میں اس حوالدار سے کہوں بھیا، تو کیوں اس بے چارے کو پریشان کرتا ہے، وہ کہے، میں تو ڈیوٹی کر رہا ہوں۔"

میں ٹرنک اور کاغذوں کے پلندے لے آیا ہوں، اس پلندے کا کیا کروں؟ کبھی سوچتا ہوں اسے چھپواڈالوں، لیکن ادھوری تحریر کو کون چھاپے گا۔ چٹنی روز بگڑتی ہے کہ میں گھر میں کچرا بھرتا ہوں۔ دو تین بار وہ پھینکنے کی دھمکی بھی دے چکی ہے، لیکن میں اسے چھپاتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی تختے پر رکھ دیتا ہوں، کبھی پلنگ کے نیچے چھپا دیتا ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ کسی دن یہ بھی گلی میں پھینک دیے جائیں گے۔

□□□

مترجم کا پتہ:
F-58, Sector-40,
Noida-201301, (U.P.)

جمیل اختر

شمس الرحمٰن فاروقی سے ایک ملاقات

سوال:دلّی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے، صرف چار کاموں کے لیے – اس سے اردو کا کس حد تک بھلا ہوگا؟ کیا آپ اس قانون سے مطمئن ہیں؟

جواب: میں مطمئن تو نہیں ہوں لیکن یہ بھی نہیں کہتا کہ بھلا نہیں ہوگا۔ جہاں کچھ بھی نہیں تھا اس کے مقابلے میں کچھ ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں یقیناً خوش آئند تبدیلی ہو گی۔ ایک تو جو کچھ ملا ہے، ہم لوگوں کو اس پر عمل درآمد کروانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چپ نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اس کی مزید توسیع کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کئی برسوں کی کوشش کے بعد معاملہ یہاں تک پہنچا ہے۔ اس پر قناعت نہیں کرنا چاہیے بلکہ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اس قانون میں وسعت لائی جائے اور مزید کاموں کے لیے اردو کا استعمال کیا جائے۔ جو قانون بنا ہے، میں اس سے قطعی مطمئن تو نہیں ہوں لیکن خوش اس لیے ہوں کہ کچھ نہ کچھ تو پہل ہوئی ہے، کچھ تو شروع ہوا ہے جہاں کچھ نہیں تھا۔

سوال:موجودہ قانون میں اردو تعلیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کیا تعلیم کے بغیر زبان زندہ رہ سکتی ہے؟

جواب: کوئی قانون تو تعلیم کے لیے بن نہیں سکتا۔ دستورِ ہند میں جن زبانوں کا ذکر ہے اور جو دفعات موجود ہیں، ان میں یہ کہیں ذکر نہیں ہے کہ ان زبانوں کو پڑھایا جائے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نہرو کے زمانے میں مشہور سہ لسانی فارمولا بنایا گیا تھا جس پر شاید ہی کہیں عمل درآمد ہوا ہو، اگر ہوا بھی تو پورا نہیں ہوا، اس کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ ایکٹ میں تو یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ لکھا جائے کہ اس زبان میں تعلیم دی جائے۔ لیکن چونکہ اردو دوسری سرکاری زبان تسلیم کی جا چکی ہے اس لیے آپ مزید یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں ایسے اسکول دیے جائیں جن میں اس زبان میں تعلیم ہو۔ یہ تو ممکن ہے لیکن قانون میں آپ یہ تقاضا نہیں کر سکتے۔

سوال:بہار میں جب اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا تو وہاں قانون میں یہ سہولت دی گئی تھی کہ اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے گا اور جہاں دس بچے بھی ہوں گے، وہاں اردو ٹیچر دیا جائے گا تو کیا یہاں قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی جاسکتی تھی؟

جواب: رکھنے کو تو رکھ سکتے ہیں لیکن ایک تو یہاں اردو میڈیم اسکول پہلے سے موجود ہیں (یہ اور بات ہے کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔) انھی اردو میڈیم اسکولوں کو پہلے ہم سنبھالیں اور ٹھیک کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورتِ حال میں جبکہ اردو میڈیم اسکول موجود ہیں غالباً یہ ضروری نہیں تھا کہ ایکٹ میں اس کا ذکر کیا جائے؟ اب رہ گیا کہ انھوں نے کہا کہ جہاں دس بچے ہوں گے وہاں اردو تعلیم دی جائے گی، مجھے نہیں معلوم کہ اس پر کس حد تک عمل درآمد ہوا۔ آپ کہتے ہیں تو ہو گا— یقیناً ہو گا۔ اس کا نفاذ یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر یہ تو آگے کی منزل ہے، اگر ایسا ہوتا تو اچھا ہے۔ مگر میں نہیں جانتا کہ جو مراعات اردو کو انھوں نے دی ہیں، ان مراعات کی روشنی میں اس کا نفاذ ممکن ہے کہ نہیں؟

سوال:اس سے قبل 1958 میں ایک ایکٹ بنا تھا جس میں اردو تعلیم کا باضابطہ ذکر ہے۔ یہ قانون تو اُس سے بھی کم لگتا ہے؟

جواب: ہاں کم ہے۔ میں نے تو خود ہی کہا کہ کم ہے۔ میں اس سے مطمئن نہیں ہوں لیکن ایک طرح کی خوشی کا اس لیے اظہار کر رہا ہوں کہ اس کی مجھے واقعی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اس لیے کہ موجودہ پالیسیاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ عام طور پر اردو سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی ہیں۔ سیاسی حالات کی بنا پر یہ کیا گیا ہے۔ اس سے ایک راستہ ہمیں مل گیا ہے۔ ایک دروازہ کھل گیا ہے اور یقین ہے کہ ہم اردو والے اگر اس دروازے پر مستقل دستک دیتے رہیں گے تو اور بھی دور تک اندر جانے کی اور مراعات کے محل میں جگہ بنانے کی گنجائش پیدا ہو گی۔

سوال:کیا اردو صرف مراعات پر زندہ رہ سکتی ہے؟ یا اس کو آئینی تحفظ کی ضرورت ہے؟

جواب: میں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ اگر کسی زبان کو زندہ رہنا ہے تو اس کا پہلا اور آخری جو طریقہ ہے، خود اس زبان کے بولنے والوں کا دیرہ اور عمل۔ مان لیجیے کہ مراعات مل بھی جائیں اور حکومت اور چیزیں بھی آپ کو دیدے، اس کے باوجود بھی یہ ممکن ہے کہ آپ کی زبان نہ پھلے پھولے۔ اگر بولنے والے نہیں ہیں تو پھر کس مقبرے میں جا کر آپ اردو کی کتاب پڑھائیں گے؟ ہمارے ہاں چونکہ جمہوریت ہے اور جمہوریت میں ہر اقلیت کا

حق ہے کہ اس کے لیے اس کی زبان، اس کی ثقافت اور اس کی تہذیب کا تحفظ کیا جائے، اس کے فروغ کے لیے انتظام کیا جائے، اس بنا پر یہ مانگ کی جارہی ہے — کچھ یہ بھی ہے کہ اردو اور ہندی کا جو مسئلہ ہے، پرانا ہے اور جو اس کی تاریخ ہے، اس میں تلخیاں بہت ہیں۔ بہت ساری زیادتیاں بھی اردو کے ساتھ ہوئی ہیں تو ان تلخیوں اور زیادتیوں کے پس منظر میں بھی یہ عذر مناسب ہے کہ ہم اپنے لیے مراعات اور آسانیاں مانگیں لیکن زبان محض حکومتی تحفظ، حکومت کی دی ہوئی مراعات، حکومت کی بخشی ہوئی آسانیوں کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اپنے بولنے والوں کے عمل پر چلتی ہے۔ اگر ہم زبان کو بولنا چھوڑ دیں گے، اس کو لکھنا پڑھنا چھوڑ دیں گے، تو حکومت لاکھ پڑھائے کون پڑھے گا اس کو؟

سوال: اردو کی بقا کے لیے کس طرح کے قانون کی ضرورت ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ میں کسی قانون کا تقاضا نہیں کرتا۔ میں یہ مانتا ہی نہیں کہ قانون اگر ہوگا تو بقا رہے گی اردو کی اور قانون اگر نہیں ہوگا تو بقا نہیں رہے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ قانون کی ضرورت یوں ہے کہ جو اس زبان کے بولنے والے، اس تہذیب کے امانت دار، اس تہذیب کے وارث ہیں اور جو اس پورے ثقافتی سرمایے کا اپنے کو نگہبان کہتے ہیں، ان کی کوششوں میں ایک اور قدم، ایک اور مضبوطی، ایک اور امداد حاصل ہو جائے ان کو — ورنہ یہ بالکل غلط بات ہے کہ ہم یہ سمجھتے رہیں کہ دیکھیے اس قانون کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہم اگر یہ کہیں کہ اردو کے تحفظ کے لیے قانون ضروری ہے تو قانون کس طرح کا ہونا چاہیے۔ اگر اس طرح کا قانون نہ پاس کیا گیا تو ہم نے اپنے آپ ہی یہ شکست منظور کرلی کہ وہ قانون ہی نہیں ہے تو پھر تحفظ کہاں سے ہو، بقا کہاں سے آئے۔ یہ تو ایک منفی اور بالکل غلط سوچ ہے کہ فلاں طرح کا قانون ہو جو ہمیں تحفظ دے۔ تحفظ تو ہم اپنا خود کرتے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم جمہوریت میں بہت بڑی اقلیت ہیں، لسانی اقلیت ہیں، تہذیبی اقلیت ہیں اور بہت بڑا سرمایہ ہندستانی تہذیب میں ہمارا ہے۔ اس کے تحفظ، بقا اور فروغ کے لیے آپ کو کچھ کرنا چاہیے تو آپ کچھ کریں لیکن ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ نہیں کریں گے تو یہ مٹ جائے گی۔ اگر ہم یہ کہہ رہے ہیں تو گویا ہم غداری کررہے ہیں اپنی تہذیب سے۔

سوال: کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کن باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے؟

جواب: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کو زبان سے محبت ہو اور وہ اس پر فخر کریں۔ مگر جو بات افسوس کی ہے وہ یہ کہ ہم نے اپنی زبان میں کیڑے نکالنے، اپنی زبان میں برائیاں نکالنے اور برائیاں ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مثلاً میں نے ایسی تحریریں بہت کم دیکھی ہیں جن میں اردو رسم خط اور اردو املا کی تعریف کی گئی ہو کہ بڑا خوب صورت ہے، بڑا اچھا ہے، بہت آسان ہے اور اس طرح کی تحریریں میں نے بہت دیکھی ہیں کہ رسم خط بہت مشکل ہے، املا بڑا ہی بے ڈھنگا ہے، غیر سائنٹیفک ہے۔ تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ہمارے دل میں اپنی زبان کے لیے وہ محبت، وہ لحاظ اور وہ احترام نہیں ہے جو کسی بھی شخص کے دل میں اپنی زبان کے لیے ہوتا ہے۔ آپ انگریزی یا فرنچ لے لیجیے، انتہائی لچر، انتہائی مہمل طریقہ ہے ان کے لکھنے کا۔ ان کے املا کے طریقے تو اس طرح کے ہیں ہی، ان کا طرزِ تحریر بھی ناقص و نامکمل ہے، مگر کبھی کسی نے یہ نہیں سنا کہ کوئی کہہ رہا ہو کہ فرنچ کا املا بدل دیا جائے یا اس کے حروف بدل دیے جائیں۔ اپنے یہاں روزانہ یہ سننے میں آتا ہے کہ یہ س ہے تو ص کیوں ہے، ص ہے تو ث کیوں ہے۔ اور تو میں نے کہیں یہ سب سنا نہیں۔ اردو کے ترقی نہ کرنے کے اسباب بہت ہیں۔ لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اردو والوں کا ذہن اردو کے تئیں صاف نہیں ہے۔ دیکھیے تین باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں۔

اردو لشکری زبان ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ ہم اس کے بولنے والے ہیں، ہم کیسے ہیں۔ گویا ہم پہلے ہی یہ طے کرلیتے ہیں کہ یہ فوجیوں کی زبان ہے۔ اور فوج کے معنی کیا ہیں قتل و غارت گری، لوٹ، بے ایمانی، ظلم یہ چیزیں فوجوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو ہم جب یہ کہتے ہیں کہ یہ لشکری زبان ہے تو گویا ہم پہلے ہی اسے وابستہ کردیتے ہیں ظلم، جبر اور اغیار کے ساتھ جب کہ یہ لشکری زبان قطعی نہیں ہے، کہیں سے بھی نہیں ہے۔ پھر ہم خود ہی یہ کہتے ہیں کہ اس کا رسم خط عربی فارسی کا ہے، اس میں غیر زبانوں کے لفظ بہت سے ہیں جو غیر ضروری ہیں۔ انگریزی میں ہزاروں لفظ ایسے ہیں جو غیر ضروری بھرے ہوئے ہیں مگر ان کو تو کوئی نہیں ٹوکتا ہے تو ہمیں ہی کیوں کہا جائے۔ میں نے تو ایک بار لکھ کے دکھایا تھا کہ صرف "ش" کو ادا کرنے کے لیے انگریزی میں گیارہ، بارہ طریقے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں یہ کہتا کہ آپ نے "ش" کو ادا کرنے کے لیے اتنے طریقے کیوں بنائے تو پھر ہمیں کیوں کہا جاتا ہے؟

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ رسم خط غیر ملکی ہے اور ہمارا املا مشکل ہے۔ اس زبان میں ستر فیصد الفاظ ہندستانی الاصل ہیں، چند فیصد الفاظ عربی فارسی کے ہیں۔ جو ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں نہیں ہیں کیا؟ عربی میں

عبرانی زبان کے الفاظ بھرے ہوئے ہیں لیکن لوگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اردو کا اصل جوسرمایہ ہے عربی فارسی کا ہے، اردو کا رسم خط غیر ملکی ہے اور اردو کا املا بہت ٹیڑھا ہے۔ بہت اصلاح کی ضرورت ہے۔ بار بار سنتا ہوں۔ اصلاح زبان، اصلاح املا، اصلاح قواعد، بھئی بولنے والا تو زبان کی بڑی قدر کرتا ہے۔

سوال:اصلاح کی بات تو الگ رہی، یہاں تو رسم خط کو تبدیل کرنے کی بات بھی بار بار اٹھائی گئی ہے۔

جواب: رسم خط کی تبدیلی تو اردو کے لیے بالکل سم قاتل ثابت ہوگی۔ اس کا مخالف ہوں، میں ایک لفظ سننے کو تیار نہیں ہوں۔

سوال:اردو رسم خط کو برقرار رکھتے ہوئے، اُسے دیوناگری اور رومن میں بھی لکھنے کی بات کی جارہی ہے۔ گلوبلائزیشن کے زمانے میں اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے تاکہ رسم خط سے ناواقف لوگ بھی اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس تجویز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: دیوناگری اور رومن ہی کیوں— چائنیز کیوں نہیں؟ یہ بلاوجہ کی باتیں ہیں۔ ارے بھئی آپ کو اگر میری زبان سیکھنی ہے تو بسم اللہ۔ لائیے کتاب، پڑھیے پڑھاتے ہیں ہم آپ کو۔ دنیا میں بہت سی زبانیں ہیں۔ چائنیز ہے، جرمن ہے، فرنچ ہے، رشین ہے، ان سے تو کوئی نہیں کہتا کہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے، آپ اپنا رسم خط بدل دیجیے۔ یہ ایک مہمل بات ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جس کو زبان سے دلچسپی ہوگی، وہ اس کو سیکھنے آئے گا اور اس کی شرطوں پر سیکھے گا۔ یہ نہیں کہ شرطیں آپ کی ہوں اور پڑھاؤں میں، شرطیں میری ہوں گی جب میں پڑھاؤں گا۔ یہ بالکل غلط ہے اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح پڑھنے والے بڑھ جائیں گے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جس شخص کو اردو نہیں آتی، اس کو آپ رومن میں اردو لکھ کر پڑھوایئے۔ اگر اس نے صحیح پڑھ دیا تو میں اردو لکھنا پڑھنا چھوڑ دوں گا۔ پڑھے گا ہی نہیں وہ۔ یہ کہنے کے معنی کیا ہیں کہ زیادہ لوگ پڑھ لیں گے اس کو۔ اور پھر یہ کہ رومن ہی میں کیوں اور دوسری زبانوں میں بھی لکھیے آپ۔ یہ اردو کے ساتھ ایک قسم کا سنگ دلانہ مذاق ہے اور اردو والوں کو بے وقوف بنانے، ان کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے، پریشان کرنے، پسپا کرنے کا یہ بھی طریقہ پیدا کر دیا گیا ہے۔

سوال:اردو کی بقا کے لیے خود اردو والوں کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: صرف ہمپل، سادہ اور معمولی تجویز ہے کہ بھیّا! بچوں کو اردو پڑھاؤ، تھوڑا وقت نکال لو ٹی وی دیکھنے اور بازاروں میں گھومنے سے — بس تھوڑا سا وقت بچوں کو اردو پڑھانے کے لیے نکال لو۔ جیسے ہمارے باپ نے کیا، تمھارے باپ نے کیا۔ اولاد کو آپ ایسے اسکولوں میں بھیج رہے ہیں جہاں اردو نہیں پڑھائی جارہی ہے۔ آخر کہاں پڑھیں وہ اردو؟ گھر میں پڑھیں۔ گھر میں پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ وقت نکالیں۔ دوستوں میں گپ شپ کرنے سے، کناٹ پلیس گھومنے یا پارکوں کی سیر کرنے سے، ٹی وی سیریل اور فلم دیکھنے سے کچھ وقت نکال لیجیے اور روزانہ دو گھنٹے بیٹھ کر پڑھایئے بچوں کو۔ اگر یہ نہیں کریں گے آپ تو وہ اپنے آپ تھوڑے ہی پڑھ لیں گے۔

سوال:اردو اور اردو کلچر کے پھیلاؤ کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟ کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے؟

جواب: برابر غور ہی کرتا رہا ہوں۔ رسم خط کی تبدیلی کے بارے میں کوئی بات نہ کریں آپ اور یہ کہیں کہ دنیا کے حسین ترین رسم خط میں ایک ہمارا رسم خط ہے۔ املا کے بارے میں بات نہ کرو، کہو کہ دنیا میں کوئی املا مکمل نہیں۔ ہمارا املا مکمل نہیں ہے مگر ہم اسی پر خوش ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں کوئی نظام مکمل نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے بارے میں یہ مت کہو کہ یہ لشکری زبان ہے، یہ مت کہو کہ اس میں فارسی عربی کا دور دورہ ہے۔ اردو زبان کے بارے میں کسی بھی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا مت ہوؤ۔ اور اردو پڑھنے پڑھانے کے لیے اپنی مصروفیات میں سے ایک گھنٹہ روزانہ نکالو۔

سوال:کیا ہندستان کا موجودہ منظرنامہ اردو ذریعہ تعلیم کے حق میں ہے؟

جواب: بھیا! منظرنامہ کیا؟ پڑھاؤ تو پڑھیں گے بچے، مہاراشٹر میں آخر کیسے پڑھ رہے ہیں۔ آخر ایسی باتیں ہم لوگ کیوں کہتے ہیں۔ منظرنامہ حق میں ہے، منظرنامہ حق میں نہیں ہے۔ منظرنامہ کیا ہوتا ہے؟ پڑھنے والے ہوں اور پڑھانے والے ہوں۔ مہاراشٹر میں سبھی پارٹیوں کی حکومت رہی ہے۔ وہاں کیسے اردو کے اسکول کھلے ہوئے ہیں؟ آخر بچے پڑھ رہے ہیں کہ نہیں؟

نہ پڑھیں تو اس میں منظرنامے کی بات کیا ہوئی؟ یوپی کے لوگ اہل زبان ہونے کے دعویدار ہیں، لکھنؤ کے اردو کے اور کہاں کہاں کے، ان کے یہاں اگر اردو نہیں ہے تو یہ ان کی کمی ہے نا۔ اس میں منظرنامے کی کیا کمی ہے؟ اسی منظرنامے میں مہاراشٹر بھی ہے، کرناٹک، دلّی اور بہار بھی ہے۔ منظرنامے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو صرف زبان کے بولنے والوں کے ایمان، ان کی قوتِ ایثار اور ان کی قوت اعتماد پر منحصر ہے۔

□□□

رتن ناتھ سرشار

("فسانۂ آزاد" جلد اوّل سے اقتباس)

مزے مزے کی باتیں اور عشقِ صادق کی گھاتیں

اُن سرد بن بہار پرورد
گل غنچۂ عشق و لالہ درد

یعنی میاں آزاد خانہ برباد، قدم قدم پر آہِ سرد بھرتے اور نفسِ امارہ پر نفریں کرتے میاں ظر آف کے مکان پر پہنچے تو وہاں افیونیوں کے پشت و پناہ، میاں خوجی لوحش اللہ چانڈو کے نشہ میں غیں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بلا یہاں کہاں سے آئی۔ اے لاحول بھئی اس نے تو بے طور پیچھا کیا ہے۔ مگر خیر اس وقت پڑا رہنے دو۔ پھر سمجھا جائے گا۔ میاں آزاد پلنگ پر لیٹے تو اِدھر اُدھر لوٹ مار رہے ہیں، مگر سونا حرام۔ نیند نہیں آتی۔ پلک کا جھپکنا مشکل ہو گیا۔ ہائے فعلِ بد کا نتیجہ بھی بد ہے۔ کس بری گھڑی اللہ رکھی سے آنکھ لڑائی۔ کیا شامت آئی۔ اور ستم پر ستم یہ کہ میاں خوجی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ رات بھر سونے کے عوض رویا کیے۔ یہ سوچ رہے تھے کہ اتنے میں غنچۂ صبح کھِل کھلایا۔ اور میاں آزاد کو شوق چرآیا، کہ چلو حسن آرا سے ملو۔ سچ ہے:

علی الصباح چو مردم بکار و بار روند
بلا کشانِ محبت بکوی یار روند

چلے تو ذرہ ذرہ گل خیر۔ قطرہ قطرہ بادۂ مسرّت سے لبریز، بادِ بہار گلفشاں۔ یہ بلبل زار مسرّت غزل خواں۔ ساغر نوش بدمست، مغ بچے طرب پرست، اِدھر سبزے کی لہک، اُدھر قطرہ ہائے شبنم کی جھلک۔ میاں آزاد نے ایک بھٹی کے قریب دو شرابیوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھ کر کہا کہ خدائی خوار گدھے اسوار، تم دونوں پر شیطان کی پھٹکار، خدا کی مار، یہ وضع اور یہ جوتی پیزار، سرِ بازار تکرار، اور مار دھاڑ۔ ذرا تو دل میں شرماؤ۔ مارے خفت کے زمین میں گڑ جاؤ۔ ان میں سے ایک نے کہا:

رندانِ در میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

دوسرے نے اس کو چھوڑ کر ان کا پیچھا کیا۔ ان کو پیچھا چھڑوانا مشکل ہو گیا۔ اب سنیے کہ اس نے آکر یکمانہ تاک۔ میاں آزاد کی ٹوپی اچھال دی۔ میاں آزاد جھلائے اور وہ دونوں بھی طیش میں آئے اور لگا گدا چلنے۔ آزاد نے چپت لگائی، اور دھول جمائی، ہات ترے کی۔ تڑ اور پھٹ، دھم اور کھٹ، تڑاق اور پڑاق، بازار میں ہلّو مچا ہوا۔ تماشائی ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع۔ اتنے میں غل جو ہوا تو میاں خوجی پینک سے چونک پڑے۔ ظر آف کی لونڈی نے کہا میاں ایسی نیند نوج کسی بھلے مانس کو آئے۔ آزاد سے باہر گدّے بازی ہو رہی ہے، اور تم یہاں خرانٹے لے رہے ہو۔ اتنا سننا تھا کہ میاں خوجی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا، تو لٹھ نہ ڈنڈا۔ انھوں نے جھپ سے چانڈو کی نگالی اٹھائی۔ اور لپکے، اور لپکتے ہی غل مچایا کہ اب لو گیدی ٹھہر جا میں آن پہنچا۔ شرابیوں نے جوان پر نظر ڈالی تو واہ جی واہ کیا قطع شریف ہے۔ ننھے سے آدمی، ٹینی مرغے کے برابر قد۔ اور یہ خم اور دم۔ انھوں نے آزاد سے اپنے کو چھڑا کر ان کی خبر لی۔ جھلا کر آپ نے نگالی اٹھائی۔ ایک نے نگالی چھینی، اور لگا کھٹا کھٹ جمانے، میاں ہی کی جوتی میاں ہی کا سر۔ دوسرے نے کسی سے پوچھا نہ پاچھا، جھپٹ کر میاں خوجی کو کاٹ کھایا۔ اتنے میں میاں آزاد نے چپکے سے اپنی راہ لی۔ خوجی بے چارے پٹ پٹا کر اٹھے، کچومر نکل گیا۔ مگر واہ رے خوجی، پھر بھی وہی خم و دم ہیں، وہی تیکھی چتون۔ ماشہ بھر کا تو قد شریف، مگر اکڑے ہی جاتے ہیں، اور دونوں شرابیوں کو اس طرح گھور رہے ہیں، جیسے کھا ہی جائیں گے۔ حوالی موالی حضرت کی قطع دیکھ دیکھ کر لوٹن کبوتر ہوئے جاتے ہیں۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ اب خوجی ہیں کہ دنیا بھر کو گالیاں دے رہے ہیں۔ آخر کار جھاڑ پونچھ کر چل دیے۔ لونڈی نے کہا واہ میاں گئے تھے پیٹنے اور الٹے پٹ کر آئے۔ اتنی پڑیں بے بھاؤ کی کہ کھوپڑی گنجی ہو گئی۔ چاند پر ایک بال تک نظر نہیں آتا۔ خوجی بہت جھلائے اور آگ بھبھوکا ہو کر کہنے لگے کہ چپ شہکارہ تو ہمیں کیا جانے کھوپڑی گنجی کیسی۔ یہ گنجی کھوپڑی کے کیا معنی؟ آخر یہ تو نے کہا کیا۔ ہماری کھوپڑی پر بال تھے ہی کب۔ یہاں پیدائشی ہی ایسے بال ہیں۔ اور صاف چاند تو خوش اقبالوں کی نشانی ہے۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا کہ اب ہٹو بھی۔ آئے وہاں سے بڑے اقبال مند بن کر۔ واہ کیا اقبال ہے۔ صورت سے تو پھٹکار برستی ہے۔ اقبال والے بنے ہیں۔ خوجی دانت پیس کر رہ گئے، اور بولے کہ بس چلی جا۔ نہ ہوئی جوانی۔ ورنہ کھود کر اسی جگہ دفنا دیتا۔ □□□

● "فسانۂ آزاد" کلاسیکی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ فنی اعتبار سے یہ داستان اور ناول کے درمیان کی تعلیق ہے۔ "فسانۂ آزاد" نہ صرف زبان و بیان اور معاشرے کی عکاسی کی وجہ سے بلکہ اپنی دلچسپ کرداروں کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے۔ قومی اردو کونسل نے حال ہی میں "فسانۂ آزاد" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

مشیر الحسن

چودھویں قسط

جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی

"تم ایک بات کہتے ہو"، پردیپ نے کہا، "لیکن ابھی کل ہی نخاس میں میری ملاقات ترویدی سے ہو گئی اس نے بالکل مختلف انداز میں بات کی۔ اس نے گروگول والکر کی کتاب سے ابواب اور عبارتوں کے حوالے دے کر اس بات کی وضاحت کی کہ انگریزوں نے اتنے وسیع و عریض اور متنوع ملک پر اپنے تسلط کو کیوں کر پھیلایا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ذہن کو پریشان کر دینے والا ہے۔ تم نے کہا کہ 1901 میں ملک کی کل 294,000,000 آبادی میں یورپین اور پوندی (Allied) نسل والے لوگوں کی تعداد محض 170,000 تھی۔ اس طرح چند لوگ اتنے بہت سارے لوگوں کے مقدر کے مالک تھے اور اتنی طویل مدت تک تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے کس طرح اتنی آسانی سے اطاعت قبول کر لی"۔

"میں خود حیران ہوں"، جگ موہن نے کہا، "تم ہندستانی ایمپائر کی وسعت بتاؤ گے؟"

"ارے، ترویدی"۔ عزیز نے کہا، "وہ آریہ سماج کے گڑھ لاہور کے ایک ڈی اے وی اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ مجھے بہت نہیں معلوم ہے سوائے اس کے کہ اس کے بانی دیانند سرسوتی تھے۔ ذاتوں کے امتیازات کو (ورن کے نظام کی مخالفت کیے بغیر) پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بت پرستی کو ترک کیا اور موحدانہ اور غیر بُت پرستانہ ویدک دھرم کی تمام دوسرے مذاہب پر برتری کی تصدیق کی۔ انھوں نے 1863 سے 1875 تک لمبے لمبے سفر کیے اور بمبئی اور کلکتے میں ممتاز مصلحین سے ملاقاتیں کیں۔ کلکتے میں وہ بیوگی، کم سنی کی شادی اور تعلیم کی کمی جیسے عورتوں کے مسائل سے واقف ہوئے، بنگالی مصلحین میں یہ مسائل اس وقت زیر بحث تھے۔ جلد ہی 1860 کا یہ جہاں گرد سنیاسی ایک سماجی اور مذہبی مصلح، ہندستان کا ہونے والا لوتھر بن گیا۔

دس اصول جنھیں ہر آریہ کو رکنیت کی درخواست دیتے وقت ماننا پڑتا تھا وہ اس کے عقائد اور اس کے اصولوں کی واحد مصدقہ تفسیر ہیں۔

1. خدا تمام حقیقی علم اور اس کے وسیلے سے جانی جانے والی ہر چیز کا مبدا و ماخذ ہے۔
2. خدا علم مکمل ہے، حسنِ مکمل ہے، غیر مادّی ہے، قادر مطلق ہے، منصف، رحم کرنے والا، غیر زائیدہ (لم یولد)، کسی ابتدا کے بغیر ہے (Without a beginning) ناقابل بدل ہے، عدیم المثال ہے۔ ہر شے کا سہارا سب کا آقا ہے، All-pervading اور ہمہ داں ہے۔ لازوال اور لافانی ہے، بے خوف ہے، ابدی وازلی ہے، پاک ہے اور کائنات کا سبب۔ صرف اسی کی عبادت ہم پر فرض ہے۔
3. وید علم حقیقی کی کتابیں ہیں اور ہر آریہ کا سب سے بڑا فرض انھیں پڑھنا، انھیں سننا، دوسروں کو پڑھانا اور دوسروں کو سنانا ہے۔
4. ہر آریہ کو حق کو ماننے اور جھوٹ سے انکار کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
5. تمام اعمال نیکی کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یعنی ہر کام صحیح اور غلط کے بارے میں پورے غور وخوض کے بعد کرنا چاہیے۔
6. سماج کا بنیادی فریضہ ہے بنی نوع انسان کی جسمانی، روحانی اور سماجی حالت کو بہتر کر کے ساری دنیا کو فائدہ پہنچانا۔
7. ہر شخص کے ساتھ محبت، انصاف اور اس کی خوبیوں کو دیکھ کر سلوک ہونا چاہیے۔
8. جہالت کو ختم کرنا چاہیے اور علم کو پھیلانا چاہیے۔
9. کسی شخص کو صرف اپنی خوبیوں پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔ ہر شخص کو وہ چاہے عورت ہو یا مرد، صرف اُس خوشحالی اور سکھ کو اپنا سمجھنا چاہیے جس میں دوسروں کے سکھ اور دوسروں کی خوشحالی شامل ہو۔
10. اُن معاملات میں جن کا اثر ہماری نسل کی عام سماجی فلاح و بہبود پر ہوتا ہو، ان میں کسی کی ذاتیات کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ صرف خالص ذاتی معاملات میں ہر شخص آزادی سے عمل کر سکتا ہے۔

"ان دس اصولوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز ایک دوسرے کو متحد کرنے والی نہیں ہے۔ اعتقادی تعلیمات صرف وہ ہیں جو پہلے تین اصولوں میں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں آریہ سماج کا خدا کا عقیدہ، God-Head کا تصور اور ویدوں کے متعلق اس کی تعلیمات بتائی گئی ہیں۔ یہ یقیناً سادہ ترین مسلک ہے، جس کی حمایت و پیروی میں کسی ہندو کو کسی حالت میں بھی کوئی دشواری نہیں ہونا چاہیے۔

"مگر آریہ سماج"، جگ موہن نے سوال کیا، "پنجاب میں اتنی مقبول کیوں ہوئی؟ بہت دن ہوئے میرے چچا نے بتایا تھا کہ پنجابیوں نے دیانند کے

طریقے کے لیے بڑی گرمجوشی دکھائی جبکہ برہمو سماج کی طرف ان کا رویہ عدم دلچسپی کا رہا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ برہمنوں اور پنڈتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اور خالص ویدک ریتوں، رواجوں اور اس کے اپنے صحیفوں کو عوام کو واپس دے کر دیانند نے پنجابیوں کو اصلاح کے عمل سے اور حبِ قومیت سے محرومی کے احساس سے آزادی دلادی"۔

"کیا یہ تحریک کیمونل (فرقہ پرست) تھی؟" پردیپ نے پوچھا۔

"یہ یقیناً مسلم دوست یا اسلام دوست نہیں تھی"، عزیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دیانند کے ایک پیروپنڈت لیکھ رام نے "آریہ گزٹ" نکالا۔ انھوں نے اس رسالے کو اسلام کے خلاف اپنے غم وغصے کو نکالنے کا ذریعہ بنایا۔ وہ بھی آخر میں ایک دوسرے آریہ سماجی لیڈر شردھانند کی طرح قتل کیے گئے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے شدھی کرن میں آریہ سماج شامل تھی، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو دھرم کی طرف واپسی کی رسومات آریاؤں نے ادا کیں اور ایسی تقریبات کی سرپرستی کی۔ دیانند نے، جو اپنے زمانے کی ایک دیو پیکر شخصیت تھے، اپنے پیچھے رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی کوئی وراثت نہیں چھوڑی۔ وہ خود بھی مسلمانوں کے بہت بڑے نکتہ چیں تھے۔ ان کی مشہور کتاب، "ستیار تھ پرکاش"، پنجاب میں اسلام مخالف نزاعی بحث و مباحثے کی بنیاد بنی۔ بحیثیت مجموعی اگر دیکھئے تو بنگال میں اصلاحی تحریکوں کا کردار یقیناً زیادہ لبرل اور زیادہ وسیع المشرب تھا۔ یہ صورت حال پانچ دریاؤں کی سرزمین اور مہاراشٹر میں نہیں تھی"۔

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ پردیپ ایک کٹر سناتنی آریہ سماج کے بارے میں کچھ بہت نہیں جانتا تھا، جگ موہن کی واقفیت بھی زیادہ نہیں تھی۔ اور پھر اس کی دلچسپی انڈین ایمپائر میں تھی۔ اس کے استفسارات کے جواب میں عزیز نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انگریزوں نے 540000 مربع میل کے علاقے پر حکومت کی۔ یہ علاقہ بنیادی طور پر مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ زمین کی ایک پتلی پٹی سے باہم جڑے ہوئے ڈیلٹا (بنگال پریسیڈنسی) اور جنوب میں برصغیر کے ضمیمے (Appendix) (مدراس اور بمبئی پریسیڈنسی) پر مشتمل تھا۔ درمیانی علاقوں میں راجوں مہاراجوں کی ریاستیں تھیں۔ ان کی بقا کے ضامن راجدھانی میں کمپنی کے فوجی دستے تھے۔ اس ضمانت کی اجرت ان کو ریاستوں کے حکمرانوں سے ملتی تھی جن کی حرکات و سکنات پر برٹش ریزیڈنٹ نظر بھی رکھتا تھا اور انھیں کنٹرول بھی کرتا تھا۔ یہ راجے مہاراجے تقریباً نوے ملین آبادی کے براہ راست حاکم تھے اور تقریباً ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل کے علاقے کی جو لگ بھگ ایک سو چالیس ایک سو پچاس ملین باشندوں پر مشتمل تھا، پاسبانی کرتے تھے۔

1818 میں بنگال میں فورٹ ولیم کی پریسیڈنسی میں بہار، اڑیسہ اور بنارس کے کنارے کے فتح کیے ہوئے اور عطا کیے ہوئے صوبے شامل تھے۔ انھیں صوبہ آگرہ (1834) اور شمال مغربی صوبہ جات (1836) کا نام دیا گیا۔ فورٹ ولیم والی بستی میں 1928 میں کہیں زیادہ یورپین تھے۔ دو ہزار ایک سو بچھے یورپیوں میں سے تقریباً ایک ہزار پانچ سو پچانوے یورپین بنگال میں رہتے تھے خصوصاً کلکتے میں۔ اسی طرح 1900 میں بمبئی پریسیڈنسی میں شہر (Town) بمبئی کا جزیرہ، بمبئی گودی کا جزیرہ، Salsette کا جزیرہ، جنوبی کوکن میں دور افتادہ بنکوٹ کا اسٹیشن (فورٹ وکٹوریہ) اور سورت کا شہر اور ضلع شامل تھا اور اس کی یورپین آبادی ایک سو سولہ سے زیادہ نہیں تھی۔ مدراس پریسیڈنسی ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل پر محیط سات ضلعوں کے علاقے پر مشتمل تھی۔

ہندستان پر ایک مستبدانہ طرز کی حکومت تھی اور رپن کی وائسرائی اصلاحات ہونے تک اور صوبوں میں 1892 کے انڈین کاؤنسل ایکٹ کے نفاذ تک نمائندہ حکومت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ پابندِ شرائط، سول سروس کمپنی راج کا ڈھانچہ تھا۔ 1793 کے چارٹر ایکٹ میں قانونی حیثیت ملنے کے بعد سول سروس میں تقررات کو باضابطہ کرنے کا اختیار 1857 کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ کو دے دیا گیا تھا۔ قطعی تقرر سے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ ایک معاہدہ یا اقرار نامہ ہوتا تھا۔ اس میں وائسرائے کے تئیں وفاداری اور سرکاری ضوابط کے مطابق رکھی گئی شرائط کو ماننے کا عہد کرنا ہوتا تھا۔ آئی سی ایس افسروں کی تعداد کسی ایک وقت میں، 1859 میں 846 اور 1899 میں 1021 کے درمیان گھٹتی بڑھتی رہی۔ 1879 میں آئی سی ایس میں صرف ایک ہندستانی تھا۔ 1902 تک بتیس مزید افراد اس حیثیت میں داخلے کے لائق ہوئے۔ 1902 میں ایک ہزار سرسٹھ افسروں میں چالیس ہندستانی تھے۔

1806 میں Hert Ford میں قائم ہونے اور 1809 میں Hailey Bury میں منتقل ہونے والے ایسٹ انڈیا کالج نے انتظامیہ اور عدلیہ کے لیے افسر تیار کیے اور بہتر پبلک اسکول خصوصاً رگبی، مارلبرو اور ویلنگٹن نے انڈین آرمی کو اس کے آفیسرز مہیا کیے۔ فوج نے ایشیا اور افریقہ میں برطانوی برتری اور فوقیت کو برقرار رکھنے کے وسائل فراہم کیے۔ غدر کے چالیس سال بعد ہندستانی فوجیں، چین (1859)، ایتھوپیا اور سنگاپور (1867) ہانگ کانگ (1868) افغانستان (1878) مصر (1882) برما (1885) نیاسالینڈ (1893) سوڈان اور یوگنڈا (1890) گئیں۔

ہندستان اور خشک سمندروں میں برطانوی بیرک تھا جہاں سے انگریز بغیر کوئی معاوضہ دیے ہوئے جتنی فوجیں چاہیں حاصل کر سکتے تھے۔ شروع

شروع میں فوج مختصر سی تھی مگر انقلاب فرانس اور نپولین جنگوں کے دوران ان میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اور یہ فوجیں جو 1790 میں 115000 تھیں۔ 1805 میں بڑھ کر 155000 ہو گئیں۔ 1857 میں فوج 34000 یوروپین اور 257000 ہندستانیوں پر مشتمل تھی۔ ٹکس کا ادا کرنے والا ہندستانی نہ صرف یہ کہ اپنی ماتحتی اور غلامی کا معاوضہ دے رہا تھا بلکہ تقریباً نصف انگریزی فوج کے راتب (رسد) کا انتظام بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ اس طرح ہندستانی ایمپائر ایک سیاسی اور اقتصادی املاک تھی۔ اس کے محصولات اور اس کی مین پاور نے ایمپائر کی ریڑھ کی ہڈی کا کام کیا، اس نے دفاع کی ڈھال فراہم کی اور زنجبار سے بصرہ اور مشرق کی سمت میں Yellow Sea تک مزید پیش قدمی کے لیے تلوار مہیا کی۔ جزوی طور پر یہی صورت حال جنوبی سمندروں میں بھی تھی۔ کیونکہ ہندستانی فصیل (Bastion) نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے تحفظ میں بھی مدد کی۔ ان کے درمیان سپاہیوں اور رائل نیوی نے سارے مشرقی سمندروں اور پیسفک میں تجارتی قلمرو کی حفاظت کی۔ 1908 میں ہندستان سے متعلق لبرل سکریٹری آف اسٹیٹ جان مارلے نے، انگریزی فوج کے خزانے میں ہندستان کے سالانہ حصے کو 420000 پاؤنڈ سے بڑھا کر 720000 پاؤنڈ کر دینے کی وار آفس کی درخواست کو مان لیا۔ اس بات پر جب لارڈ کچنر نے اعتراض کیا تو وار آفس نے جواب میں کہا کہ منصفانہ برتاؤ کے اصول کا نفاذ صرف خود مختار اتحادی ریاستوں پر ہوتا ہے، کسی ایسی ماتحت ریاست پر جس میں غیر اور بے گانہ نسلیں آباد ہوں یہ اصول نافذ نہیں ہوتا۔

"ارے یہ آئی سی ایس والے"، جگ موہن نے کہا، "بڑے بڑے بنگلے بنواتے ہیں اور ان کے بچے قیمتی کاروں میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ جلد ہی وہ ایک دو سوانح عمریاں لکھیں گے جس میں ہمیں بتائیں گے کہ انھوں نے کس طرح سلطنت کی بنیادوں کو اندر سے کھوکھلا کیا"۔

"میرے دادا جان"، پردیپ نے بیان کیا، "کہیں گے تم کپلنگ کو یہ جانے بغیر پڑھ ہی نہیں سکتے کہ آئی سی ایس اصل اور بنیادی سروس تھی اور یہ کہ اس نے سنٹرل سکریٹریٹ میں خود سب سے اوپر بیٹھ کر اور ضلع کے افسر کو سب سے نیچے رکھ کر ملک کو کس طرح چلایا"۔

عزیز جب بھی کسی چیز کے بارے میں شدت سے محسوس کرتا تو اس کا عموماً طریقہ یہ تھا کہ وہ بیچ کمرے میں اس طرح کھڑا ہو جاتا جیسے لوگ کہیں جانے سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میں پہلے کب اتنا جھنجھلایا ہوں۔ شعبے میں سازشیں ——— توبہ۔ محض آدھا درجن استاد اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔

"ڈپٹی کلکٹر کو کیا کام سونپے گئے تھے۔ میں جب بھی بارہ بنکی جاتا ہوں، لوگوں کو اُسے مائی باپ کہتے سنتا ہوں"۔

جب جگ موہن نے کلکٹر کے بارے میں سوال کیا اس وقت عزیز شعبے کی آئندہ طوفانی میٹنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

ان بچاروں کے بارے میں کیا ہے؟ ہاں کلکٹر اکثر ہندستانیوں کے لیے حقیقتاً حکومت تھا۔ 1800 کے بعد اسے چھوٹا اگرچہ کسی قدر کریم النفس فرماں روا سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہندستان میں جہانبانی کے برطانوی تصور کی اصل شبیہ تھا۔ اس قبیلے کا ایک بہت دل چسپ تذکرہ بی آر البیری میکے کی کتاب "Twenty One Days in India" میں ملتا ہے۔

پردیپ جگ موہن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی اس مسکراہٹ میں خوشی بھی تھی اور استہزا بھی۔

☆☆☆☆☆

اس بظاہر مستحکم قلمرو کے لیے 1857 کی بغاوت ایک بہت بڑا دھماکہ تھی۔ "دی ٹائمز" (لندن) کے نامہ نگار ڈبلیو ایچ رسل نے لکھا، "انگریزوں کے سامنے ایک صرف غلاموں کی جنگ یا ایک طرح کے کسانوں کاشتکاروں کی ملی جلی لڑائی نہیں تھی۔ یہ لڑائی مذہب کی اور نسل کی لڑائی تھی اور ایک بدیسی حکومت کے جوے کو اتار پھینکنے کے لیے ایک انتقامی جنگ تھی۔ فوری سبب وہ چربی لگے ہوئے کارتوس تھے جن کے اوپر ایک خول چڑھا رہتا تھا۔ کارتوس چلانے سے پہلے جسے دانت سے کاٹ کر نکالنا ہوتا تھا۔ سپاہیوں کو بتایا گیا تھا کہ خول میں لگی ہوئی چربی گائے اور سور کی تھی۔ گائے ہندوؤں کے لیے مقدس اور سور مسلمانوں کے لیے حرام تھا۔ یہی وہ چنگاری تھی جس نے ہندستان میں جو بارود تھی اس میں آگ لگادی۔

جون 1857 کی اس بغاوت سے متعلق مارکس نے اپنے پہلے مضمون میں چربی لگے کارتوس اور سپاہیوں کو اپنے مذہب کے لیے خطرے کو اس ہنگامے کا سینہ سبب بتایا۔ اس نے یہ بات اپنی کسی رائے یا کسی قسم کی تحقیق کے بغیر کی۔ مگر اسے جلدی ہی اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ فوج میں بڑے پیمانے پر ایک سازش ہوئی تھی اور یہ کہ عوام کے انگریز مخالف جذبات بھڑک گئے تھے۔

دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر میرٹھ میں لوگوں نے دس اور گیارہ مئی 1857 کو بغاوت کی۔ باغی سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کیا اور بہادر شاہ کو اپنا لیڈر بنادیا۔ اس کے بعد بغاوت کی آگ بہت سی دوسری جگہوں میں لگی۔ دہلی کے جنوب مشرق میں بلبھ گڑھ کے جاٹ راجہ نے اپنے خاندان کی قدیم وفاداری کے نام پر بادشاہ کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ لکھنؤ میں بغاوت 30 مئی کو اڑتالیس نیٹو انفنٹری میں شروع ہوئی اور پندرہ دن کے اندر سارے اودھ میں

پھیل گئی۔ گورنر جنرل کیننگ نے 19 جون 1857 کو لکھا کہ روہیل کھنڈ اور دو آب دہلی سے کانپور اور الہ آباد تک سارا ملک صرف یہی نہیں کہ انگریز کے خلاف بغاوت میں مصروف تھا بلکہ بیکسر بے قانون اور بے لگام ہو گیا تھا۔ مارکس نے لکھا ہے کہ ہندستانی فوج میں بغاوتیں ہوتی رہی تھیں مگر یہ سرکشی اور اطاعت سے روگردانی کچھ مختلف تھی۔ اور یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ سپاہیوں کی ریجی منٹس نے اپنے یورپین افسروں کو قتل کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے، اپنی باہمی نفرتوں کو بالائے طاق رکھ کر بہادر شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔ مارکس کا کہنا تھا کہ شورش محض چند بستیوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق ایشیا میں برطانوی تفوق کے خلاف ایک عام بے چینی سے تھا۔ بنگال آرمی کی بغاوت، پرشین اور چائنا کی جنگوں سے جوڑی جارہی تھی۔

کوئی نہیں جانتا کہ اتنی پُر تشدد شورش کیوں ہوئی اور کیوں اتنی جلدی ختم ہو گئی۔ کیا یہ محض سپاہیوں کی بغاوت تھی، عوامی مدافعت، عوامی شورش یا ایک دم توڑتی ہوئی فرسودہ استبدادی حکومت کی آخری کراہیں تھی یا زمانے کو ایک بار پھر جاگیردارانہ نظام کی تنہائی اور ظلم و ستم کی طرف لے جانے کی کوشش؟ ایک چھوٹی سی چنگاری جس نے آتش گیر مادّے کے ڈھیر کو آگ لگادی؟ کیا یہ ہندستانی جنگ آزادی تھی؟ ہندستانی قومیت کی صورت گری میں جن جذبات کی کارفرمائی تھی وہ 1857 میں انگریزوں سے نفرت کے اظہار میں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ قومیت کے نوزائیدہ احساس نے جدید سیاسی قوم کی شکل ابھی اختیار نہیں کی تھی۔ اپنی روایتی مراعات کو قائم رکھنے کے لیے لڑنے والے بڑے بڑے جاگیردار بغاوت کی رہنمائی کر رہے تھے۔ نئے طرز کی قومیت کو ابھی معرضِ وجود میں آنا تھا۔

جنگ کے مطلب کو اُن آئینی رشتوں میں ڈھونڈا جاسکتا ہے جو اس وقت کمپنی اور مغل بادشاہوں کے مابین تھے۔ کمپنی نے لگان دار (vassal) کی حیثیت کو قبول کر لیا تھا مگر 1843 میں گورنر جنرل نے رواج کے مطابق تحفے تحائف دینے سے انکار کر کے اُس اصلی شرط کو توڑ دیا جس نے کمپنی کو بادشاہ سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کمپنی کے سپاہیوں کی بغاوت نہیں بلکہ باغی و سرکش کمپنی کے خلاف اپنے بادشاہ کے پاس ان کی واپسی تھی۔

تو کیا یہ عظیم بغاوت، وسیع مسلم سازش کے نتیجے کے طور پر ایک مسلم سازش تھی؟ نہیں، سید احمد خاں نے اعلان کیا، سید احمد خاں جنھوں نے صدر امین کی حیثیت سے بجنور میں ساری انگریز آبادی کو بچایا تھا۔ اپنی کتاب "An Account of the Loyal Mahomedans of India" میں انھوں نے انگریزوں کے اس عام یقین کی تردید کی کوشش کی کہ اس ساری سازش اور سرکشی کو ان کے ہم مذہب افراد نے منظم کیا تھا۔ اس سے پہلے لکھی ہوئی اپنی ایک کتاب میں انھوں نے 1857 کی بغاوت کے اسباب بتائے تھے۔

1. ملک اور اس کے عوام سے حکومت کی ناواقفیت۔ جس کا نتیجہ یہ کہ عوام الگ تھلگ۔ ان کا کوئی قائدیار ہمنوا ایسا نہیں تھا جو ان کے حقوق کے لیے سینہ سپر ہو اور یہ دیکھے کہ ان کو انصاف ملتا ہے۔ اسی لیے عوام خاموشی سے روتے رہنے پر مجبور تھے۔
2. عوام کی اور خصوصاً مسلمانوں کی بکبت اور ان کا افلاس۔
3. ایسے قاعدوں اور ایسے قوانین کا اپنایا جانا جو ہندستان کے مانے ہوئے رسوم و رواج سے ٹکراتے تھے۔ اور مذہبی احساسات کی تحقیر کرتے تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ عوام کو یہ یقین تھا کہ حکومت یکساں طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں پر عیسائیت اور مغرب کے طور طریقے کو تھوپنا چاہتی ہے۔
4. فوج کا خراب انتظام اور اس میں پھیلی ہوئی بے اطمینانی۔
5. لگان سے مستثنیٰ زمینوں کی بازدخلی۔

سید احمد خاں صحیح تھے مگر شاید انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ بغاوت کے خدوخال مختلف اضلاع بلکہ گاؤں اور گاؤں میں بڑی حد تک الگ الگ تھے۔ اور ان کا تعین معیشت کے ان پیچیدہ جوڑوں اور رشتوں کی بنیاد پر ہوتا تھا جو حق ملکیت کے طریقوں اور استعماری ریاست کے متنوع اثرات کا پرتو ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک کے محض چھٹے اور آبادی کے چوتھائی سے بھی کم حصے پر اثرانداز ہوئے۔ پنجاب اور بنگال دونوں وفادار رہے۔ میرٹھ کنٹونمنٹ میں بغاوت کے شروع ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر لاہور میں بنگال آرمی کے سپاہیوں کو غیر مسلح کرنے کی کارروائی انگریزوں کے لیے حکمت عملی کی ایک بڑی کامیابی ثابت ہوئی۔ دہلی سے باہر رہ کر انگریزی فوجوں کے لیے کمک فراہم کرنے کے لیے پنجاب میں مسلمان، سکھوں اور کوہاٹ کے قبائلیوں کے ساتھ مل گئے۔ شمال مغربی صوبوں میں انھوں نے توقع سے کہیں بہتر کارکردگی دکھائی۔ راجا عموماً ایسی استقامت کے ساتھ ٹکے رہے کہ کیننگ کو انھیں طوفان میں پشتہ کہنا پڑا۔ حیدرآباد کے نظام اور رامپور، کرنال، مرادآباد اور ڈھاکہ کے نواب وفادار رہے۔ باغیوں میں سے ایک راجہ ہنومنت سنگھ نے یہ بات بے سبب نہیں کہی تھی کہ بغاوت دبائی صرف اس لیے جاسکی کہ یہ سارے ہندستان میں نہیں بلکہ اودھ میں ہوئی۔

(جاری)

(مترجم: مسعود الحق)

□□□

139, Uttarakhand, JNU, New Delhi-110 067

وی. ایس. گپتا

کیریئر گائیڈنس

ذرائع ابلاغ (پرنٹ میڈیا) میں کیریئر کے مواقع

بیسویں صدی کے اواخر میں ڈسپلن اور پیشہ کے طور پر ذرائع ابلاغ میں ڈرامائی تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا دائرہ اب صرف روایتی طرز یعنی پرنٹ میڈیا، نشریات، رابطہ عامہ، ایڈورٹائزنگ تک محدود نہیں رہا ہے۔ اس میدان میں نمو کی رفتار حیرت انگیز ہے اور نئے اقسام اور انداز کے ذرائع ابلاغ مثلاً کارپوریٹ، مواصلات، انٹرنیٹ اور صحافت اپنی گوناگوں دلفریبی اور دل پذیری کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ نئے نئے پیشے جن کا ہم اس سے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا قدیم تصور، یک لخت بدل چکا ہے اور اس کی جگہ ایک نئے تصور نے جنم لیا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے مساوی کام آئی وی سی یعنی اطلاع، تعلیم اور مواصلات کی جگہ آئی سی ای یعنی اطلاع مواصلات اور تفریح نے لی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں دستیاب روزگار کے مواقع کا ذکر کرتے ہوئے اس مضمون میں پرنٹ میڈیا سے متعلق تفصیلات بہم پہنچائی جارہی ہیں۔

پرنٹ ذرائع ابلاغ کا تناظر

بھارت میں پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات، رسالے اور کتابوں کی طباعت و اشاعت روز افزوں اور ترقی پذیر صنعت ہے۔ حالیہ برسوں میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ خاص طور پر علاقائی زبانوں کے پریس نے بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلا روک ٹوک خبریں، بے خوف اور بے لاگ اداریے، اخباری تبصرے اور مضامین جو یہاں کے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتے ہیں، ملک کے طرز حکمرانی پر کافی اثر انداز ہوئے ہیں۔

رجسٹرار آف نیوز پیپرز ان انڈیا (آر. این. آئی) کی 46 ویں سالانہ رپورٹ، پریس اِن انڈیا 2002 کے مطابق بھارت میں 2001 کے دوران اخبارات اور رسالوں کی تعداد میں 5 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ رجسٹرڈ اشاعتوں کی تعداد جو 2000 میں 49145 تھی، 2001 میں بڑھ کر 51960 ہو گئی یعنی اس میں 1815 کا اضافہ ہوا ہے۔ روزنامہ اخبارات کی تعداد جو 2000 میں 5364 تھی، 2001 میں بڑھ کر 5638 ہو گئی۔

بھارت میں شائع ہونے والے اخبارات ملک کی 101 زبانوں اور بولیوں میں شائع ہوتے ہیں۔ انگریزی اور 18 دیگر سرکاری زبانوں کے علاوہ 82 دیگر زبانوں، بولیوں اور غیر ملکی زبانوں میں بھی اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ زبانوں کے لحاظ سے روزانہ اخبارات کی تعداد اس طرح ہے۔

ہندی میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ یعنی 20589 ہے۔ اس کے بعد انگریزی کے اخبارات آتے ہیں جن کی تعداد 7596 ہے۔ اس کے علاوہ مراٹھی میں 2943، اردو میں 2906، بنگالی میں 2741، گجراتی میں 2215، تامل میں 2119، کنڑ میں 1816، ملیالم میں 1505 اور تیلگو میں 1289 اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ سرکولیشن کے لحاظ سے بھی ہندی اخبارات آگے ہیں۔ 2001 میں ہندی اخبارات کی اشاعت 47006,395، انگریزی اخبارات کی 23094,261 اور ملیالم کی 72,53,625 تھی۔ اس طرح ملیالم اخبارات کا اشاعت کے لحاظ سے تیسرا نمبر ہے۔

روزنامہ اخبارات میں پہلا مقام ہندی کا ہے جس کے 2001 میں 2507 اخبار روزنامہ چھپتے تھے۔ اردو روزنامے دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ ان کی تعداد 534 ہے۔ انگریزی اخبارات تیسرے نمبر پر تھے یعنی انگریزی کے 407 اخبارات شائع ہوتے تھے۔ جن زبانوں کے 100 سے زیادہ روزنامہ اخبارات چھپتے تھے ان کی تعداد اس طرح تھی۔ مراٹھی (395)، تامل (366)، کنڑ (364)، ملیالم (225)، تیلگو (180)، گجراتی (159)، پنجابی (107) اور بنگالی (103)۔ یومیہ سرکولیشن کے لحاظ سے ہندی ڈیلی پریس سب سے آگے تھا۔ اس کی اشاعت 2,33,82,867 کاپیاں تھی۔ جو کل اشاعت کا 40.42 فیصد تھی۔ انگریزی اخبارات دوسرے نمبر پر تھے، ان کی سرکولیشن 87,07,803 تھی۔

2001 کے میں سب سے زیادہ اخبارات اتر پردیش میں شائع ہوئے، ان کی تعداد 8397 تھی۔ اس کے بعد دہلی میں (6926)، مہاراشٹر میں (6018)، مدھیہ پردیش (3555)، مغربی بنگال، راجستھان، تامل ناڈو، کرناٹک، آندھرا پردیش، گجرات، کیرالہ، بہار، پنجاب اور ہریانہ ریاستوں میں سے ہر ایک میں شائع ہونے والے روزناموں کی تعداد 1000 سے زیادہ تھی۔

سرکولیشن کا انداز

آر. این. آئی. کی درجہ بندی کے مطابق جن اخبارات کی یومیہ اشاعت 75000 یا اس سے زیادہ ہے، وہ بڑے اخبارات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جن اخبارات کی یومیہ اشاعت 25001 سے 75,000 کے درمیان ہے وہ متوسط درجے کے اخبارات ہیں اور جن اخبارات کی اشاعت 25000 سے کم ہے ان کو چھوٹے اخبارات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے

ملک میں 275 بڑے، 954 متوسط اور 3551 چھوٹے اخبارات ہیں۔ بڑے اخبارات کا سرکولیشن 4,86,85,163 یومیہ ہے جب کہ درمیانے اور چھوٹے اخبارات کا سرکولیشن بالترتیب 3,99,51,182 اور 2,66,17,603 ہے۔ بڑے اخبارات کا سرکولیشن کل اخبارات کے سرکولیشن کا 42.24 فی صد، درمیانے اخبارات کا 34.66 فی صد اور چھوٹے اخبارات کا 23.10 فی صد ہے۔ 45,974 رسالوں میں 27,027 کا تعلق خبروں اور حالات حاضرہ سے ہے جب کہ 4368 رسالے ادبی اور ثقافتی نوعیت کے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی رسالے مذہبی معاملات، فلسفہ، تجارت اور صنعت، میڈیسن، صحت، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی، آرٹ، سائنس، بچوں، فلموں اور اسپورٹس کے بارے میں ہیں۔

2001 میں بھارت میں پریس۔ ایک جھلک

اخبارات کی تعداد

یومیہ اخبارات	5638
ہفتے میں دو یا تین بار شائع ہونے والے اخبارات	348
ہفتہ وار	18582
پندرہ روزہ	6881
ماہانہ	14634
دیگر	5877
کل تعداد	51960
متفرقات (خبروں کے علاوہ)	3590
ریکارڈ کے مطابق کل تعداد	55,550

اخبارات کا سرکولیشن

یومیہ اخبارات	57844236
ہفتے میں دو یا تین بار شائع ہونے والے اخبارات	515701
ہفتہ وار	32416604
پندرہ روزہ	8452754
ماہانہ	13421269
دیگر	2603384
کل تعداد	115253948

ٹیکنالوجی کا کردار

صحافت میں ٹیکنالوجی کی کلیدی اہمیت نہ صرف ماضی کی طرح اب بھی برقرار ہے۔ بلکہ اس میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے صحافیوں کے نہ صرف کام کرنے کے طور طریقے یکسر بدل دیے ہیں بلکہ پرنٹ میڈیا کی ڈیزائننگ اور انھیں پیش کرنے کے انداز میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ ٹیکنالوجی نے علاقائی خبروں کو نہ صرف قومی بلکہ اس سے اعلاتر سطح پر پہنچانے میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات مختلف علاقوں کی مقامی خبروں کے لیے اب علاحدہ صفحات شائع کرتے ہیں تاکہ خبروں کو زیادہ زوردار انداز میں پیش کیا جاسکے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار پڑھنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہورہا ہے۔ ڈسک ٹاپ پبلشنگ کی حالیہ ترقی اور کم لاگت پر پرنٹنگ ٹیکنالوجی نے چھوٹے پیمانے کے اخبارات کو اپنے پیر پھیلانے کے کافی مواقع فراہم کرائے ہیں۔ اس لیے ضلعے کے صدر مقام پر مختلف زبانوں کی صحافت کے خاطر خواہ مواقع دستیاب ہیں۔

پرنٹ میڈیا میں روزگار کے مواقع

صحافت کے پیشے کے خواہشمندوں کے لیے اس پیشے میں روزگار کے کافی مواقع دستیاب ہیں لیکن معاملہ جدوجہد بھرا، صبر آزما اور ولولہ انگیز ہے۔ اس پیشے کو اب ہر سطح پر مردوں سے زیادہ خواتین اختیار کرتی جارہی ہیں۔

اس پیشے کو اختیار کرنے سے قبل ان تمام اخبارات اور ایجنسیوں کی فہرست تیار کیجیے جن کی اس شہر میں بیورو یا دفاتر قائم ہیں اور جہاں آپ کام کرنا چاہیں گے۔ آپ کسی علاقائی اخبار کے ایڈیٹر یا بڑے اخبار کے بیورو چیف کو درخواست دیں۔ بیشتر اخبارات اپنے اخبار کے کالم میں ملازمتوں کا اشتہار بھی دیتے ہیں۔ لہٰذا مکمل چھان بین اور معلومات حاصل کرنے کے بعد اس اخبار میں اپنی ذاتی تفصیلات بھیجنا زیادہ سمجھداری ہوگا۔ اگر آپ جرنلزم میں گریجویٹ ہیں تو اپنے کسی فیکلٹی ممبر سے مل کر اس سلسلے میں ضروری مشورہ کیجیے اور روزگار کی راہیں تلاش کیجیے۔ بہتر ہوگا کہ آپ متعلقہ شخص سے وقت لے کر خود اس کو اپنی ذاتی تفصیلات پیش کریں۔ فون پر اطلاع ملتے ہی فوراً ملیے۔ اگر آپ کے پاس مطبوعہ مضامین ہیں تو انھیں اپنے بایوڈاٹا کے ساتھ منسلک کر دیجیے۔ کامیاب صحافی بننے کے لیے آپ میں اعلادرجے کی صحافتی صلاحیت ہونی چاہیے۔ کمپیوٹر کی بنیادی جانکاری ضروری ہے۔ اس کے ساتھ حالات حاضرہ کی کافی جانکاری مفید ثابت ہوگی۔ آج کل صحافت کا پیشہ آرٹس یا سوشل سائنس گریجویٹ سے زیادہ دیگر شعبوں کے طلبہ کے لیے باعثِ کشش ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ ضلع کے صدر مقام پر قومی یا علاقائی اخبار میں اسٹرنجر کی حیثیت سے کام کرنا پسند کریں گے یا اسٹافر کی حیثیت سے۔ اسٹرنجر کی حیثیت سے کام کرنے کی صورت میں آپ ایک سے زیادہ اخباروں میں ایک ساتھ کام کرسکتے ہیں جس کے نتیجے میں بعض اوقات

اسٹرنجر کی اسائنمنٹ زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ اسٹرنجر کی حیثیت سے آپ کو رپورٹنگ اور کالم نویسی کے بنیادی اصول سیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چند سال کے بعد آپ کو مکمل اسٹاف کی حیثیت سے بھی مواقع دستیاب ہو سکتے ہیں۔ کئی ممتاز روزناموں کے ضلعے کے صدر مقام پر اپنے دفاتر اور بیورو قائم ہوتے ہیں۔ ان دفاتر اور بیورو کو رپورٹر کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے نئے جرنلزم گریجویٹوں کی تلاش رہتی ہے۔

عام طور پر نوجوان گریجویٹ سب ایڈیٹر کی حیثیت سے رپورٹر کا کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ گھومنا پھرنا سب کو اچھا لگتا ہے جس کو کوئی چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ اس بارے میں میری صلاح یہ ہے کہ صرف رپورٹنگ پر اصرار نہ کیجیے بلکہ دیگر مواقع کے لیے بھی اپنے ذہن کو کھلا رکھیے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو ڈیسک جاب سے رپورٹنگ کی طرف بھی اپنے آپ کو منتقل کر سکتے ہیں۔

کسی روزنامے میں کیریئر شروع کرنے سے پہلے آئندہ کے مواقع اور امکانات کو ذہن میں رکھیے۔ ترقی کے ان مواقع کو اپنے ذہن میں رکھیے جو آپ کو اس روزنامے میں کام کرتے ہوئے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ابتدا میں رپورٹر کو شہر میں گھوم پھر کر خبریں اکٹھا کرنے کی ڈیوٹی پر مامور کیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ بزنس رپورٹنگ یا سیاسی رپورٹنگ میں بھی خصوصی مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ شہر رپورٹر یا خصوصی نامہ نگار کا درجہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ڈیسک پر کام کرتے ہوئے بھی وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے چیف سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر اور ایڈیٹر کے منصب تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

حال میں فارغ التحصیل جرنلزم گریجویٹوں کے لیے خبر رساں ایجنسیاں بھی کیریئر کا ایک اہم ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ہندستان کی سب سے بڑی نیوز ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی. ٹی. آئی.) میں ہندی اور انگلش دونوں کی خدمات دستیاب ہیں۔ اس ایجنسی کی ہندی زبان کی نیوز سروس بھاشا کہلاتی ہے۔ پی ٹی آئی کی خدمات حاصل کرنے والے اخبارات کی تعداد 450 سے زیادہ ہے۔ جو بھارت اور بھارت سے باہر شائع ہوتے ہیں۔ بھارت کی ٹیلی ویژن، ریڈیو اور کئی خبر رساں ایجنسی جس میں بی. بی. سی. لندن بھی شامل ہے۔ پی ٹی آئی کی خدمات حاصل کرتے ہیں، پی. ٹی. آئی. کے ملک بھر میں 100 سے زیادہ کئی غیر ملکی نامہ نگار بھی کام کرتے ہیں۔ اس میں 400 سے زیادہ صحافی اور تقریباً 300 اسٹرنجر کام کرتے ہیں۔

ملک کی ایک اور بڑی خبر رساں ایجنسی یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو. این. آئی.) ہے۔ اسے ایشیا کی تین عظیم خبر رساں ایجنسیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے ملک و بیرون ملک 100 سے زیادہ بیورو ہیں۔ 1000 سے زیادہ اخبارات اس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو ملک اور ملک کے باہر 30 سے زیادہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں 300 سے زیادہ صحافی کل وقتی کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس ایجنسی میں 400 سے زیادہ اسٹرنجر بھی خدمات انجام دیتے ہیں۔ یو این آئی کی ہندستانی زبان میں مکمل نیوز سروس ہے جو یونیوارتا کہلاتی ہے۔ اس نے دنیا میں پہلی بار ٹیلی پرنٹر اردو سروس شروع کی ہے۔ اگر آپ کیمرہ اچھی طرح استعمال کرنا جانتے ہیں تو آپ کو فوٹو جرنلسٹ کے کام کے بھی اچھے مواقع مل سکتے ہیں۔

جرنلسٹ بننے کے خواہشمند امیدوار اس بات کا خیال رکھیں کہ جرنلزم صبح 9 سے شام 5 بجے تک دفتری نوعیت کا کام نہیں ہے۔ یہ وقت طلب کام ہے جس کے لیے آپ کو ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ بھی کام کرنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن یہ Challenging ہونے کے ساتھ ساتھ اطمینان بخش کام ہے۔ صحافی کو اپنے پیشے میں کام کرتے کرتے نظام حکومت کے انتہائی اہم پہلوؤں، سیاست کی پیچیدگیوں اور دور حاضر کے اہم سماجی اور اقتصادی رجحانات کی گہری جانکاری حاصل ہو جاتی ہے۔ اس پیشے میں شہرت بھی ملتی ہے اور پیسہ بھی۔ شرط یہ ہے کہ محنت اور لگن سے کام کریں۔ آپ ڈیسک پر کام کرتے ہوئے روایتی انداز سے ہٹ کر رات دیر تک کام کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔ آپ کو اپنی محنت سے زیادہ صلہ ملنے کی توقع رکھنی چاہیے۔ اگر آپ اس پیشے سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں تو نئی سے نئی خبروں کی جستجو میں رہیے۔ آپ کو اپنے زور قلم پر پورا بھروسہ ہو۔ یقیناً کامیابی آپ کی قدم بوسی کرے گی۔

(بشکریہ "روزگار سماچار" 12 تا 18 جولائی 2003)

□□□

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت

تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

نعیم احسن

تیسری قسط

اِنٹرنیٹ گائیڈ

انٹرنیٹ کنکشن:

سب سے پہلے ہم انٹرنیٹ کنکشن کی قسموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ کنکشن دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ 1- ڈائریکٹ کنکشن، 2- موڈم کنکشن۔ ایک ڈائریکٹ کنکشن میں کمپیوٹر بذاتِ خود اور براہِ راست انٹرنیٹ سے منسلک ہوتا ہے۔ اس طریقے کو کئی بڑی یونیورسٹیاں اور ادارے استعمال کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ گیٹ وے کے لیے ڈائریکٹ کنکشن کے ذریعے آپ انٹرنیٹ سے ای میل بھیج اور وصول کر سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ دوسرے نمبر پر موڈم کنکشن آتا ہے۔ جس کی کئی قسمیں ہیں۔

PPP or SLIP Account, Client - Access account
Host - machine account, Online service
Bulletin Boards

(1)- پی. پی. پی. یا ایس. ایل. آئی. پی. اکاؤنٹ ہے جو آپ کے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر کو براہِ راست انٹرنیٹ سے ملا دیتا ہے۔ موڈم کنکشن آپ کے کمپیوٹر کو نیٹ سے منسلک نیٹ ورک کا حصہ بنا دیتا ہے۔ یہ قسم زیادہ مقبول ہے۔

(2)- کلائنٹ تک رسائی (Client - access) یہ سرور کے ساتھ ایک عارضی کنکشن بناتا ہے اور آپ کے ای. میل کو ڈاؤن لوڈ کرتا ہے۔

(3)- ہوسٹ مشین اکاؤنٹ میں آپ کا ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر خاموش ٹرمینل (Dumb Terminal) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس میں کی بورڈ اور مانیٹرز انفارمیشن ایک بڑے کمپیوٹر جیسے مین فریم وغیرہ کو بھیجتے ہیں۔ اس صورت میں انفارمیشن انٹرنیٹ کے ذریعے ہوسٹ کمپیوٹر کو بھیجی جاتی ہیں۔ یہ اکاؤنٹ ہوسٹ مشین عام طور پر Unix انوائرمنٹ کے ذریعے استعمال ہوتا ہے۔

(4)- آن لائن سروس اکاؤنٹ بہتر سروس اور بہتر انٹرفیس کے ذریعے انٹرنیٹ تک مکمل رسائی فراہم کرتا ہے۔

انٹرنیٹ کے لیے آلات:

اگر آپ کا کمپیوٹر براہِ راست نیٹ سے منسلک ہے تو آپ کو کسی خصوصی آلے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ای. میل پڑھنے کے لیے کمپیوٹر پر انسٹال "کلائنٹ سافٹ ویئر" چلا سکتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس ایسے پروگرام نہیں ہیں جن کے استعمال کی دوسری انٹرنیٹ سروسز کے لیے ضرورت پڑتی ہے جیسے ورلڈ وائڈ ویب، یوز نیٹ، ایف. ٹی. پی، تو آپ انھیں انٹرنیٹ پر سے تلاش کر سکتے ہیں۔

موڈم کی مطابقت:

ہر قسم کے دوسرے کنکشن کے لیے آپ کو ایک موڈم کی ضرورت ہوگی۔ موڈم کے انتخاب میں جو چیز آپ کے پیشِ نظر ہونی چاہیے وہ معیاروں کے ساتھ مطابقت ہے۔ جب ایک طویل فاصلے سے آپ کا کمپیوٹر منسلک ہوتا ہے تو دونوں طرف کوڈ کے طریقے اور ڈاٹا کو کمپریس میں مطابقت کی ضرورت ہوگی تاہم آپ ایک ایسا موڈم استعمال کر سکتے ہیں جو ڈاٹا کمیونیکیشن کے بین الاقوامی معیاروں کے مطابق کام کرتا ہو۔ مثال کے طور پر 28,800 bps موڈم کا اہم معیار V.34 کہلاتا ہے اور ذرا سست موڈم کا معیار V.32 bis ہے۔

سافٹ ویئر:

اگر آپ اپنے موڈم کے ساتھ ایک کنکشن کو ڈائل کریں گے تو آپ کو موڈم کے ساتھ ایک قسم کا کمیونیکیشن سافٹ ویئر استعمال کرنا ہوگا جو کہ ٹرمینل کو ہوسٹ کمپیوٹر کے ساتھ تفاعل کے لیے برابر کی سطح پر لائے گا۔ اگر آپ ایک پی. پی. پی. یا ایس. ایل. آئی. پی. کنکشن کے ساتھ ڈائل کر رہے ہیں تو آپ کو ایک کلائنٹ سافٹ ویئر کی ضرورت ہوگی جس کے ذریعے آپ انٹرنیٹ کے پروگرام چلا سکیں گے اور ایک ڈائل اپ سوفٹ ویئر کی جسے بعض اوقات ڈائلر یا ڈائل اپ اسٹیک کہتے ہیں۔ لیکن آپ کو ایک کمیونیکیشن پروگرام کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ کا سروس فراہم کرنے والا آپ کی ضرورت کے مطابق پروگرام فراہم کردے گا۔

آپ ایک آف لائن میل ریڈر یا نیوز ریڈر بھی لینا چاہیں گے۔ اس کے لیے آپ کنکشن لے سکتے ہیں، پیغامات اکٹھے کر سکتے ہیں اور اس کے بعد انھیں پڑھ کر ان کے جوابات دے سکتے ہیں۔ جب آپ انٹرنیٹ سے منسلک ہوں گے تو آپ کو ایسا پروگرام مل سکتا ہے جیسے Eudora Lite ایک فری میل پروگرام ہے۔

اس بات سے غرض نہیں کہ آپ کس قسم کا سافٹ ویئر استعمال کر رہے ہیں، بس آپ کو اسے پہلی دفعہ چلا کر سیٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ سافٹ ویئر کو موڈم کے متعلق اور کنکشن کی قسم کے متعلق معلومات فراہم کرنی ہوتی ہیں۔ مجموعی طور پر آپ کے سافٹ ویئر کو درج ذیل چیزوں کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہوگی۔

(1)- کس کوم (Com) پورٹ کے ساتھ موڈم منسلک کیا گیا ہے؟

(2)- کس قسم کی پیریٹی (Parity) ڈاٹا بٹس اور سٹاپ بٹس استعمال میں ہیں؟ اس کی معلومات سروس فراہم کرنے والا آپ کو بتا دے گا۔ لہٰذا آپ کو پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ پروگراموں کے ساتھ کمیونیکیشن کے لیے ٹرمینل کے ساتھ کس طرح کی برابری کی قسم کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی تو اس میں زیادہ تر VT 100 ہے۔ □□□ (جاری)

صلاح الدین

کوئز

سیاسیات

(1) پنچ شیل کا معاہدہ کن دو ملکوں کے درمیان ہوا تھا؟
(الف) ہندستان اور پاکستان (ب) ہندستان اور نیپال
(ج) ہندستان اور برما (د) ہندستان اور چین

(2) ہندستان کی خارجہ پالیسی کن بنیادوں پر قائم ہے؟
(الف) امن اور آزادی (ب) مفاد پرستی اور امن
(ج) جنگ اور سامراجیت (د) آزادی اور موقع پرستی

(3) اقوامِ متحدہ کے مستقل ارکان کی تعداد کتنی ہے؟
(الف) 6 (ب) 5
(ج) 7 (د) 2

(4) ہندستانی شہریوں کے حقوق کا نگہبان کون ہے؟
(الف) سپریم کورٹ (ب) وزیرِ اعظم
(ج) صدر (د) نائب صدر

(5) پہلا پنچ سالہ منصوبہ کب عمل میں آیا؟
(الف) 1951 سے 1956 (ب) 1952 سے 1957
(ج) 1960 سے 1965 (د) 1941 سے 1946

(6) "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ کس نے دیا تھا؟
(الف) لال بہادر شاستری (ب) راجیو گاندھی
(ج) پنڈت جواہر لال نہرو (د) اندرا گاندھی

(7) چیف جسٹس آف انڈیا کا تقرر کون کرتا ہے؟
(الف) وزیرِ اعظم (ب) نائب صدر
(ج) صدر (د) گورنر

(8) سپریم کورٹ کے ججوں کا تقرر کون کرتا ہے؟
(الف) وزیرِ اعظم (ب) نائب صدر
(ج) صدر (د) گورنر

(9) "جے جوان جے کسان" کا نعرہ کس نے دیا تھا؟
(الف) پنڈت جواہر لال نہرو (ب) لال بہادر شاستری
(ج) راجیو گاندھی (د) اندرا گاندھی

(10) لیگ آف نیشنز کا قیام کب عمل میں آیا؟
(الف) 1920 میں (ب) 1940 میں
(ج) 1945 میں (د) 1950 میں

(11) ہندستان کا قومی ترانہ کس نے لکھا؟
(الف) حسرت موہانی (ب) رابندر ناتھ ٹیگور
(ج) مرزا غالب (د) فراق گورکھپوری

(12) "یومِ حقوقِ انسانی" کب منایا جاتا ہے؟
(الف) 10/دسمبر کو (ب) 8/دسمبر کو
(ج) 5/دسمبر کو (د) 2/دسمبر کو

(13) سرد جنگ کا خاتمہ کب ہوا؟
(الف) 1995 میں (ب) 1991 میں
(ج) 1988 میں (د) 1987 میں

(14) یو. پی. ایس. سی. کے چیئرمین کا تقرر کون کرتا ہے؟
(الف) وزیرِ اعظم (ب) نائب صدر
(ج) صدر (د) گورنر

(15) پہلی آئینی ترمیم کب عمل میں آئی؟
(الف) 1952 میں (ب) 1951 میں
(ج) 1955 میں (د) 1960 میں

(16) "جہاں قانون نہیں ہے وہاں آزادی نہیں ہو سکتی" یہ کس کا قول ہے؟
(الف) آسٹن (ب) روسو
(ج) لاسکی (د) گرین

(17) ہندستان میں سرکاری نظام کتنی شاخوں میں بٹا ہوا ہے؟
(الف) دو (ب) چار
(ج) تین (د) چھ

(18) آئین ساز کمیٹی کا چیئرمین کون تھا؟
(الف) ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر (ب) ڈاکٹر ذاکر حسین
(ج) ڈاکٹر راجندر پرساد (د) مولانا ابوالکلام آزاد

(19) مندرجہ ذیل میں کون سی زبان اقوامِ متحدہ کی دفتری زبان نہیں ہے؟
(الف) عربی (ب) انگریزی
(ج) فارسی (د) فرانسیسی

(20) آئین ساز اسمبلی کا صدر کون تھا؟

(الف) پنڈت جواہر لال نہرو (ب) ڈاکٹر ذاکر حسین
(ج) ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر (د) ڈاکٹر راجندر پرساد

(21) دنیا کا طویل ترین آئین ہے:
(الف) چین کا آئین (ب) برطانیہ کا آئین
(ج) ہندستان کا آئین (د) امریکہ کا آئین

(22) آئین کے آرٹکل 370 کا تعلق کس ریاست سے ہے؟
(الف) ناگالینڈ (ب) منی پور
(ج) آسام (د) کشمیر

(23) راجیہ سبھا کا چیئرمین کون ہوتا ہے؟
(الف) نائب صدر (ب) صدر
(ج) گورنر (د) وزیر اعظم

(24) "مساوات اور سماجی انصاف" دستور کس حصے میں بیان کیا گیا ہے؟
(الف) حصہ چہارم (ب) حصہ اوّل
(ج) حصہ پنجم (د) حصہ دوم

(25) آزادی کے وقت ہندستان کا گورنر جنرل کون تھا؟
(الف) لارڈ کیننگ (ب) لارڈ مانٹ بیٹن
(ج) لارڈ ڈلہوزی (د) وارن ہسٹنگس

(26) موجودہ چیف جسٹس آف انڈیا کون ہے؟
(الف) اے. ایم. احمدی (ب) وی. این. کھرے
(ج) اے. ایس. آنند (د) فاطمہ بی بی

(27) اقوام متحدہ کا صدر دفتر کہاں ہے؟
(الف) نیویارک (ب) پیرس
(ج) لندن (د) واشنگٹن

(28) سپریم کورٹ کے ججوں کے ریٹائرمنٹ کی عمر کیا ہے؟
(الف) 70 برس (ب) 65 برس
(ج) 62 برس (د) 60 برس

(29) اقوام متحدہ کا سب سے اہم شعبہ ہے:
(الف) سلامتی کونسل (ب) جنرل اسمبلی
(ج) عملہ (سکریٹریٹ) (د) ٹرسٹی شپ کونسل

(30) پلاننگ کمیشن کا چیئرمین کون ہوتا ہے؟
(الف) صدر (ب) نائب صدر
(ج) وزیر اعظم (د) گورنر

(31) بین الاقوامی مزدور تنظیم (International Labour Organisation) کا قیام کب عمل میں آیا؟
(الف) 1946 میں (ب) 1945 میں
(ج) 1950 میں (د) 1960 میں

(32) پنچ سالہ منصوبہ کب عمل میں آیا؟
(الف) 1980 سے 1985 (ب) 1985 سے 1990
(ج) 1975 سے 1980 (د) 1990 سے 1995

(33) اقوام متحدہ کے کتنے شعبے ہیں؟
(الف) پانچ (ب) چھ
(ج) تین (د) دو

(34) مندرجہ ذیل میں سے ہمارا قومی مقصد نہیں ہے:
(الف) سیکولرزم (ب) سوشلزم
(ج) جمہوریت (د) فرقہ پرستی

(35) آئین ہند میں کتنے الفاظ ہیں؟
(الف) 90,000 ہزار (ب) ایک لاکھ
(ج) ڈیڑھ لاکھ (د) 80,000 ہزار

(36) "جے جوان جے کسان، جے وگیان" کا نعرہ کس نے دیا ہے؟
(الف) راجیو گاندھی (ب) اٹل بہاری باجپئی
(ج) اندرا گاندھی (د) پنڈت جواہر لال نہرو

(37) کتنے ممالک سارک (SAARC) کے ممبر ہیں؟
(الف) چار (ب) چھ
(ج) سات (د) آٹھ

(38) رہنما اصول (Directive Principle of State Policy) ہندستانی آئین کے کس حصے میں رکھا گیا ہے؟
(الف) حصہ چہارم (ب) حصہ دوم
(ج) حصہ پنجم (د) حصہ ہفتم

(39) اقتصادی ایمرجنسی ہندستان میں کتنی دفعہ لاگو ہوئی ہے؟
(الف) ایک دفعہ (ب) دو دفعہ
(ج) چار دفعہ (د) کبھی نہیں

(40) "داس کیپٹل" کس نے لکھی ہے؟
(الف) ارسطو (ب) افلاطون
(ج) کارل مارکس (د) لاسکی

(41) بنیادی حقوق کا تعلق ہندستانی آئین کے کس حصے سے ہے؟
(الف) حصہ اوّل (ب) حصہ دوم
(ج) حصہ سوم (د) حصہ چہارم

(42) "پنچایتی راج" سب سے پہلے کس ریاست میں عمل میں لایا گیا؟

(الف) بہار (ب) آسام

(ج) منی پور (د) راجستھان

(43) "بابائے سیاسیات" کس کو کہا جاتا ہے؟

(الف) ارسطو (ب) افلاطون

(ج) روسو (د) لاسکی

(44) قومی حقوقِ انسانی کمیشن (National Human Rights Commission) کا چیئرمین کون ہے؟

(الف) اے. ایس. آنند (ب) اے. ایم. احمدی

(ج) جے. ایس. ورما (د) این گوپالاسوامی

(45) "پولیٹکس" کتاب کس نے لکھی ہے؟

(الف) ارسطو (ب) افلاطون

(ج) روسو (د) لاسکی

(46) ناوابستہ پالیسی کا مطلب ہے:

(الف) کسی بھی فوجی طاقت یا سیاسی بلاک میں شامل نہ ہونا

(ب) کسی بھی فوجی طاقت یا سیاسی بلاک میں شامل ہونا

(ج) کسی بھی فوجی طاقت کو بڑھاوا دینا

(د) کسی بھی فوجی طاقت کو توڑنا

(47) حکومتِ ہند کا پہلا قانون افسر کون ہوتا ہے؟

(الف) چیف جسٹس آف انڈیا (ب) وزیرِ قانون

(ج) اٹارنی جنرل (د) ہائی کورٹ کا جج

(48) پارلیمنٹ کے اسٹیمیٹ کمیٹی میں کتنے ممبران ہوتے ہیں؟

(الف) تیس (ب) چالیس

(ج) بیس (د) دس

(49) یو. پی. ایس. سی. مشتمل ہے چیئرمین اور:

(الف) آٹھ ارکان پر (ب) سات ارکان پر

(ج) پانچ ارکان پر (د) چار ارکان پر

(50) راجیہ سبھا کے ممبر کتنے برسوں کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں؟

(الف) چھ سال کے لیے (ب) دو سال کے لیے

(ج) پانچ سال کے لیے (د) تین سال کے لیے

(51) ہندستان کو یونین آف اسٹیٹ کس آرٹکل میں کہا گیا ہے؟

(الف) آرٹکل 1 میں (ب) آرٹکل 4 میں

(ج) آرٹکل 6 میں (د) آرٹکل 2 میں

(52) پنچایتی راج کو کس وزیرِ اعظم نے آئینی درجہ دیا؟

(الف) راجیو گاندھی نے (ب) اندرا گاندھی نے

(ج) پنڈت جواہر لال نہرو نے (د) لال بہادر شاستری نے

(53) ہمارے ملک میں پارلیمنٹری نظام کس ملک سے لیا گیا ہے؟

(الف) برطانیہ سے (ب) امریکہ سے

(ج) فرانس سے (د) روس سے

(54) ہندستان کے آئین میں کتنے شیڈول ہیں؟

(الف) بارہ (ب) دس

(ج) آٹھ (د) پانچ

(55) ہندستانی آئین میں کتنی دفعات ہیں؟

(الف) 395 (ب) 444

(ج) 380 (د) 375

(جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں)

□□□

263, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi-110066

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت

رشید الدین خاں

اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 684، قیمت: 58.00 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام

رشید الدین خاں

مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف —

(دوسرا ایڈیشن)، صفحات: 336، قیمت: 76.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد سہیم الدین

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔2

بڑھتے قدم

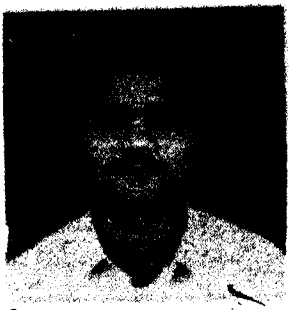

محمد محتشم خاں نے، جن کے والد ایک بزنس مین تھے، بارھویں جماعت تک سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد بی کام کیا۔ بی کام کے بعد انھوں نے کونسل کا ایک سال کا ڈپلومہ اِن کمپیوٹر اپلی کیشن اور ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کیا اور فی الحال ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: دورِ حاضر میں کمپیوٹر سے اجتناب ناممکن ہے۔ آج کل کی دنیا میں کمپیوٹر ایک ضروری چیز بن گئی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے کمپیوٹر سے دلچسپی ہونا ایک فطری بات ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: یہ ایک سرکاری ادارہ ہے اور ہمیں یہاں جو سرٹیفکیٹ ملا ہے اس کو ہم کہیں بھی پیش کر سکتے ہیں جبکہ دوسرے سینٹروں کے اسناد کو خاص طور سے جو چھوٹے چھوٹے سینٹرز ہیں ہم ہر جگہ پیش نہیں کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں معمولی خرچ میں اچھے اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق پروگراموں کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ ہی اردو کی تعلیم بھی جس سے طلبہ کو ڈی۔ٹی۔پی۔ ورک میں کافی مدد ملتی ہے یہ سہولیات دوسرے بڑے سے بڑے سینٹروں میں دستیاب نہیں ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس میں قابل ٹیچر رکھے جاتے ہیں جو طالب علموں کو اچھی تعلیم اور ٹریننگ میں کافی مدد کرتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرنے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: کافی حد تک معاون ہیں بلکہ اگر دیکھا جائے تو اس بے روزگاری کے دور میں اردو داں طبقے کے لیے قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹرز ایک امید کی کرن بن کے ابھرے ہیں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی دنیا کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور اس IT کے دور میں ہم بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: یہ زمانہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور اس زمانے میں وہی شخص کامیاب ہے جو اپنے آپ کو اس سے جوڑے اور اس کا ایک حصہ بن جائے۔ اس لیے ہمیں اس کا حصہ بن کر کافی خوشی اور خود اعتمادی کا احساس ہو رہا ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ہم اپنے آپ کو کافی بہتر مقام پر پاتے ہیں اور اس کی بدولت ہم وہ کام کر سکتے ہیں جو شاید دوسرے نہ کر پائیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: درحقیقت دیکھا جائے تو کونسل فیس لیتی ہی نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے اوپر مزید خرچ کرتی ہے۔ اس لیے کم از کم میں اپنی حد تک تو کہہ سکتا ہوں کہ بوجھ بالکل نہ تھی۔

□□□

قومی اردو کونسل کی موبائل وین آپ کے شہر آپ کے گاؤں میں

قومی اردو کونسل کی موبائل وین نے اترپردیش، بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کے بعد ایک اور بڑی اردو آبادی والی ریاست مہاراشٹر کا رخ کیا اور یہاں بھی اس کی خاطرخواہ پذیرائی ہوئی۔ 29/جون سے 27/جولائی تک کتابوں کی یہ موبائل وین مہاراشٹر کی اردو بستیوں کے دورہ پر رہی۔ اس دوران اس نے مختلف جگہوں کا دورہ کیا۔ قارئین نے موبائل وین سے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں اور قومی اردو کونسل کی اس کوشش کو بے حد سراہا۔ مختلف شہروں کے حوالے سے اخبارات میں شائع ہونے والی اس سلسلے کی چند خبریں قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

● مالیگاؤں، 5/جولائی۔ اردو کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے لیے مسلسل کوشاں رہنے والی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو والوں کے لیے کتابوں کی خرید کے لیے ایک نادر اور نایاب طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے، جس سے اردو کی کتابیں گھر گھر اردو قارئین تک پہنچائی جاسکیں۔ قومی اردو کونسل کی موبائل وین اردو کو فروغ دینے کے مقصد سے گزشتہ روز سے شہر میں موجود ہے اور اردو کتابوں کی فروخت جاری ہے۔ قومی اردو کونسل کے ذریعے تیار کی گئی اردو کی مشہور و معروف کتابوں کو لے کر یہ وین نئی دہلی سے ملک کے شہر شہر گاؤں گاؤں پہنچ رہی ہے۔ اترپردیش، بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کے بعد یہ گاڑی اب شہر مالیگاؤں میں موجود ہے۔ گزشتہ شام محمد علی روڈ اسحاق منشی ٹاؤن ہال کے پاس موبائل وین سے کتابوں کی فروخت کا سلسلہ جاری تھا اور آج صبح سے قدوائی روڈ شہیدوں کی یادگار کے پاس موجود ہے۔ اردو بولنے والے اپنا رشتہ اردو کتابوں سے مضبوط رکھیں، تعلقات استوار ہوں، اسی ہمہ گیر مقصد کے تحت اردو تہذیب و ثقافت کے اس نمائندہ شہر میں موبائل وین آئی ہے۔ ہمیں قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کتابوں کی خریداری میں اپنا قدم آگے بڑھانا ہے۔

(شاہنامہ، مالیگاؤں)

● ممبئی، 15/جولائی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ اردو حلقوں میں اردو کتابوں اور قارئین کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے موبائل بک اسٹال کی ملک کی مختلف ریاستوں میں کامیابی سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اردو کے تعلق سے حالات اتنے مایوس کن نہیں ہیں جتنے بتائے جاتے ہیں۔ ہر جگہ اردو طبقہ گرم جوشی سے اس کا استقبال کر رہا ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ موبائل بک اسٹال اردو والوں میں اردو کتابوں کے تئیں محبت اور دلچسپی کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ اور ایک طرح سے اردو کے لیے ماحول سازگار کر رہا ہے۔ اگر اس طرح کی موبائل وین کا کل وقتی انتظام ہو جائے تو اردو قارئین کی تعداد میں کمی کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

گزشتہ سال کونسل کے موبائل بک اسٹال نے اترپردیش سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اس دوران اس نے اترپردیش کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے اہم شہروں کا سفر کیا اور خلاف توقع لاکھوں روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اترپردیش کے بعد اس نے بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کا سفر کیا اور ان ریاستوں میں اسے ہاتھ ہاتھ لیا گیا۔ تازہ مرحلے میں قومی اردو کونسل کی موبائل وین مہاراشٹر میں جلگاؤں، دھولیہ، مالیگاؤں، ناسک، بھیونڈی ہوتے ہوئے ممبئی پہنچی ہے۔ **(ہندستان، ممبئی)**

● پونہ، 24/جولائی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موبائل وین پونہ میں کتابوں کی نمائش اور فروخت کی غرض سے آئی۔ اس موبائل وین میں کل 15 ہزار کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ موبائل وین کو کونڈوا، مومن پورہ، یونانی میڈیکل کالج، اعظم کیمپس، اسمبلی ہال کے پاس نمائش کے طور پر رکھا گیا۔ دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ نے موبائل وین کا خیر مقدم کیا اور فروختِ کتب کے لیے خاصی کوششیں کیں۔ اس کے علاوہ چھ ہزار روپے کی کتابیں بھی دکن لائبریری مسلم انسٹی ٹیوٹ نے خریدیں۔ **(اردو ٹائمز، ممبئی)**

● اورنگ آباد، 25/جولائی۔ قومی اردو کونسل کی موبائل وین آج شہر میں اردو داں طبقے کی توجہ کا مرکز بنی رہی، بعد نماز جمعہ موبائل وین جامع مسجد کے روبرو کھڑی تھی جہاں شائقین اور باذوق حضرات اس خزانے کو کھنگالنے میں مصروف تھے۔ موبائل وین کے انچارج وی صدیق نے بتایا کہ پہلا دن ہونے کے باوجود اطمینان بخش صورتِ حال ہے اور خریدار تعاون کر رہے ہیں۔ اس وین میں درسی، لسانی کتابوں کے علاوہ مغلیہ تاریخ خصوصاً جامع تاریخ ہند، شہنشاہ جہانگیر، شاہ جہاں وغیرہ، ادبی کتابوں میں دکن میں اردو، مولانا حالی، ابوالکلام آزاد، سرسید کی سوانح حیات، اسی طرح درسی کتب میں این. سی. ای. آر. ٹی. کے تحت پانچویں جماعت تا جماعتِ دہم کی کتابیں، سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور ٹکنالوجی کی جدید ترین کتابیں، خصوصاً کمپیوٹر کی ملٹی لنگول ڈی ٹی پی، خطاطی اور ڈیزائن کمپیوٹنگ کی کتابیں شامل ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ کے لیے یہ کتابیں چالیس فی صد رعایت پر فروخت کی جارہی ہیں۔

(اورنگ آباد ٹائمز، اورنگ آباد)

اردو خبر نامہ

اردو اکادمی کی سالانہ تقریب 'نئے پرانے چراغ'

● نئی دہلی، 5/جون۔ "اردو کی مخالفت اس خوف سے کی گئی کہ اگر اس کے پر نہیں کترے گئے تو دوسری زبانیں اردو کے سامنے ٹک نہیں پائیں گی لیکن تمام تر مخالفتوں کے باوجود اردو اپنی خصوصیات کی بنا پر پورے عالم میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔" ان خیالات کا اظہار مہمانِ خصوصی خواجہ حسن ثانی نظامی نے اردو اکادمی، دہلی کے سالانہ پروگرام "نئے پرانے چراغ" کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ مہمانِ ذی وقار پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اردو اکادمی کے اس پروگرام میں جہاں نئے قلم کاروں کو اپنے بزرگ ادیبوں کے روبرو اپنی تحریریں پیش کرنے کا موقع ملتا ہے وہیں دوسری طرف نئے چراغوں کو دیکھ کر پرانے چراغوں کو اپنی موجودہ حیثیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

اجلاس کے آغاز میں اکادمی کے چیئرمین پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے جدت اور قدامت کے امتزاج کے اس ادبی اجتماع کو نئے لکھنے والوں کے لیے تربیت گاہ سے تعبیر کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد تحقیق و تنقید پر مشتمل اجلاس ہوا جس کی مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر سید اوصاف علی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور ڈاکٹر علی جاوید شامل تھے۔ دہلی یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر یاسمین نے "شاعر ہمہ رنگ — مجروح سلطان پوری" ڈاکٹر فیضان حسن نے "ناصر نذیر فراق دہلوی — فن اور شخصیت" ڈاکٹر ظل ہما نے "فغانِ دلی سے عالمِ آشوب تک ہماری تحریکِ آزادی کی روشن پرچھائیاں" ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے "نئی غزل: جدید یا مابعد جدید" اور ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے "اقبال کی ابتدائی شاعری میں مثبت اقدار" کے موضوعات پر اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت جناب انیس اعظمی نے کی۔

دوسرے اجلاس میں حسبِ معمول افسانے اور خاکے پیش کیے گئے۔ صدارت بلراج کومل اور اظہار اثر نے اور نظامت شیخ عقیل احمد نے کی۔ نجمہ انجم "انگور میٹھے ہیں" ذکیہ ظفر نے "گھر" احمد صغیر نے "شاخِ نازک پر" انجم عثمانی نے "کہیں کچھ کھو گیا ہے" عظیم اختر نے خاکہ "تقو بھائی" اور شیخ سلیم احمد نے افسانہ "چھوٹا چوکیدار" سنایا۔ سکریٹری اردو اکادمی مرغوب حیدر عابدی نے مجلسِ صدارت میں شامل مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس سہ روزہ ادبی اجتماع کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی مجلسِ صدارت میں شامل ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کہا کہ "اردو رسمِ خط کو زندہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم نے اسے گنوا دیا تو ہم اپنے ماضی سے کٹ جائیں گے، جو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ زبان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کیوں کہ زبانیں کبھی مرتی نہیں ہیں بلکہ رسمِ خط کی حفاظت کرنا ہماری ذمے داری ہے۔" (تحقیق اور تنقید) مقالات پر مشتمل اس اجلاس کی مجلسِ صدارت کے دوسرے رکن پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ "ہر زبان اساسی طور پر ایک خاص تہذیب سے جڑی ہوتی ہے، اردو کی بھی اپنی ایک مخصوص تہذیب ہے۔ اس تہذیب پر حملے ہو رہے ہیں، اس کا تحفظ کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی تہذیب سے محروم ہو کر اردو زندہ نہیں رہ سکتی۔

اس اجلاس میں جن لوگوں نے اپنے مقالات پیش کیے، ان کے اسما اور مقالوں کے عنوانات اس طرح ہیں: ڈاکٹر انور پاشا "اردو زبان اور مشترکہ تہذیب"، ڈاکٹر شاہینہ تبسم "کلامِ میر میں تارید اور تمہید کا عمل"، ڈاکٹر کوثر مظہری "عرفان صدیقی کی شاعری میں احساسِ عشق"، ڈاکٹر مولا بخش "نئی تنقید کی بوطیقا اور مابعد جدید تحقیقِ ادب"، ڈاکٹر ارشاد نیازی "معاصر اردو تنقید: ذمے داری اور تلاش"، مشتاق صدف "اردو میں جانبدارانہ تنقید"، شہلا نواب "اردو صحافت میں بڑھتی بدعنوانیاں"، شکیل اختر "ریڈیو پر اردو ڈرامہ" اور ابو ظہیر ربانی "جوگندر پال کے افسانچے"۔

افسانے، انشائیے اور خاکے پر مشتمل دوسرے اجلاس کی مجلسِ صدارت پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر صادق، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی اور بلراج کومل پر مشتمل تھی، نظامت کے فرائض انیس اعظمی نے ادا کیے۔

"نئے پرانے چراغ" کے آخری روز 7/جولائی کے تحقیقی اور تنقیدی سیشن کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی اور پروفیسر صغریٰ مہدی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عقیل احمد نے ادا کیے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے اپنے مقالے میں سعادت حسن منٹو کی حیات اور ان کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی نے شوکت حیات کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر نفیس حسن خاں نے عزیز وارثی کی شاعری کا جائزہ اپنے مقالے "غم خانۂ عزیز" میں لیا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے مقالے کا موضوع "محمد علی جوہر کے فکری مصادر" تھا۔ ڈاکٹر وسیم بیگم نے "پروین شاکر کی غزل گوئی"، سرورالہدیٰ نے "مولوی عبدالحق کا مرتبہ دیوانِ میر عبدالحیٔ تاباں"، ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے "خالدہ جاوید کی افسانہ نگاری 'برے موسم میں' کے آئینے میں"، شاہد تسلیم نے "پریم چند جج اکبر اور تیرتھ یاترا کی روشنی میں" نوشاد عالم نے

"اخترالایمان کا نثری سرمایہ" شہزاد بانو نے "توقیت مشاہیر اردو، کچھ مسائل"، عمر فاروق نے "اساطیر کی ماہیت" اور امتیاز احمد نے "ناول کا فن" کے عنوانات سے اپنے مضامین پیش کیے۔

افسانے، انشائیے اور خاکے پر مبنی اجلاس کی مجلسِ صدارت سید ضمیر حسن دہلوی اور پروفیسر صغریٰ مہدی پر مشتمل تھی۔ نظامت انجم عثمانی نے کی۔ اس نشست میں انور نزہت، پیغام آفاقی، نصرت ظہیر، ڈاکٹر ابن کنول اور علی احمد ادریسی نے اپنی نگارشات پیش کیں۔ پڑھے گئے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر صغریٰ مہدی نے کہا کہ یہ بات خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے کہ نئی نسل سنجیدگی سے ادب تخلیق کر رہی ہے۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

ہندستان میں اسلامی تہذیب، تمدن و فلسفہ کا ارتقا

● علی گڑھ، 21ر جون۔ سینٹر فار اسٹڈیز ان سولیزیشنز (نئی دہلی) کے پروجیکٹ ہسٹری آف انڈین سائنس، فلاسفی اینڈ کلچر (نئی دہلی) کے زیرِ اہتمام ہندستان میں اسلامی تہذیب، تمدن و فلسفہ کے ارتقا پر ایک سہ روزہ قومی سمینار 18 تا 20ر جون 2003 کو کانفرنس روم، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد رفیق (سابق صدر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی) اور ایڈوائزری کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر عبدالعلی (ڈائرکٹر، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی) تھے۔ سمینار کا انعقاد شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے تعاون سے عمل میں آیا۔ یہ سمینار جناب نسیم احمد، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا اور جناب سید حامد (چانسلر، جامعہ ہمدرد و سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے اس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنے افتتاحی خطبے میں مذہب، تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کے میدان میں ہندستانی مسلمانوں کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس سے پہلے پروفیسر محمد رفیق نے سمینار کے مرکزی موضوع کی اہمیت و افادیت واضح کی اور یہ امید ظاہر کی کہ سمینار کے دوران بحث و مباحثہ سے مفید نتائج سامنے آئیں گے۔ وائس چانسلر نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اس ملک میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں نے اسے اپنا وطن بنایا اور اس کی تعمیر و ترقی میں وہ پوری سرگرمی سے شریک رہے۔ مذہب و سیاست، علم و فن اور تہذیب و تمدن کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں ہندستانی مسلمانوں نے اپنے گہرے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ افتتاحی اجلاس کے آخر میں پروفیسر عبدالعلی نے تمام معاونین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی اجلاس کے علاوہ یہ سمینار پانچ مقالاتی سیشن پر مشتمل تھا جن کی صدارت بالترتیب پروفیسر رضاء اللہ انصاری، پروفیسر محمد سلیم خاں، پروفیسر ایس ایم بجلی، پروفیسر احتشام احمد ندوی اور پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے فرمائی۔ ان پانچ اجلاسوں میں 29 مقالات پیش کیے گئے۔ مقالہ نگار حضرات میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ہمدرد (نئی دہلی)، دارالمصنفین (اعظم گڑھ)، شاہ ہمدان انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (سرینگر)، وشوبھارتی یونیورسٹی (شانتی نکیتن)، الٰہ آباد یونیورسٹی اور ایس. وی. یونیورسٹی (تروپتی) کے اساتذہ و محققین بھی شامل تھے۔ اس سہ روزہ سمینار میں جو موضوعات زیرِ بحث آئے، ان میں ہندستان میں علمِ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، فلسفہ و عقلی علوم کا فروغ، اسلامی تعلیمات و افکار کی اشاعت میں عہدِ وسطیٰ و دورِ جدید کے علما و دانشوروں کی خدمات، افکار کی اشاعت میں عہدِ وسطیٰ اور دورِ جدید کے علما و دانشوروں کی خدمات، اسلامی علوم و فنون کے ارتقا اور مذہبی و اخلاقی زندگی کی اصلاح میں مدارس و اہلِ مدارس کا حصہ، ہندستانی کلچر پر اسلام کے اثرات اور مشترکہ ہندستانی تہذیب اور اتحاد و اتفاق کی فضا پروان چڑھانے میں ہندستانی مسلمانوں کا رول خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہر سیشن میں پیش کیے گئے مقالات پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پروگرام کے آخر میں ڈائرکٹر سمینار پروفیسر محمد رفیق اور چیئرمین ایڈوائزری کمیٹی پروفیسر عبدالعلی نے تمام مندوبین، سامعین اور یونیورسٹی کے ان اساتذہ، ریسرچ اسکالرز و آفس کارکنان کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس سمینار کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے میں تعاون دیا۔ (ڈاک سے)

اردو اساتذہ کانفرنس

● بنگلور، 25ر جولائی۔ کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، بنگلور کے زیرِ اہتمام ریاست کے اردو اساتذہ کی پہلی اردو تعلیمی کانفرنس کا پیلیس گراؤنڈ پر انعقاد عمل میں آیا۔ ریاستی وزیرِ تعلیم پروفیسر بی کے چندر شیکھر نے صدارت کی جبکہ چیف منسٹر جناب ایس. ایم. کرشنا نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ مشہور اداکار اور رکنِ پارلیمنٹ جناب سنیل دت نے بحیثیتِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ صدر پردیش کانگریس کمیٹی مسٹر جناردھن پجاری بھی شریک رہے۔ جناب سنیل دت نے فصیح اردو میں کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کسی ایک فرقے یا طبقے کی زبان نہیں ہے۔ یہ شیریں زبان ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ پاکستان سے دہلی آئے تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ایک وقت کھاتے تو دوسرے وقت کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ انھیں اقبال کے اس شعر۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

سے بڑا حوصلہ ملا۔ سنیل دت نے اعتراف کیا کہ اردو کے اس شعر نے ان کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ آج وہ جس مقام پر ہیں، اسی اردو شعر کی بدولت ہیں۔ سنیل دت نے اردو اساتذہ کانفرنس کے انعقاد کے لیے کرناٹک کے وزیر چھوٹی مصنوعات جناب روشن بیگ کی ستائش کی۔ چیف منسٹر جناب ایس. ایم. کرشنا نے اپنے خطاب میں مسلم خواتین سے کہا کہ وہ استری شکتی اسکیم سے استفادہ کریں۔ جناب ایس ایم کرشنا نے کہا کہ اقلیتوں کا دیرینہ مطالبہ اردو بھون کا قیام ہے، اس کے لیے وہ بنگلور میں اراضی کے علاوہ 25 لاکھ روپیے کے عطیہ کا اعلان کریں گے۔ ریاست میں تعلیمی انقلاب جاری ہے۔ کانفرنس میں ریاستی وزرا جناب قمرالاسلام، جناب سی. آر. صغیر احمد، جناب ایم. ایل. استاد کے علاوہ جناب اقبال احمد سرڈگی رکن پارلیمنٹ سماج وادی پارٹی، شاہد صدیقی، ایڈیٹر "نئی دنیا" اور زاہد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" حیدرآباد نے بھی شرکت کی۔ (منصف، حیدرآباد)

دینی مدارس میں اردو اساتذہ کی تقرری کے احکامات

● سہارنپور، 13/جولائی۔ اقلیتی فلاح و بہبود کے وزیر کے دفتر سے ملی اطلاع کے مطابق دینی مدارس و مکاتب میں پرائمری سطح پر عصری علوم کے فروغ کے لیے مرکزی سرکار کی اسکیم کے تحت سائنس، ریاضی، ہندی اور انگریزی کی تعلیم کے لیے دو اساتذہ کی تقرری کے اختیار کے احکامات جاری کیے گئے ہیں۔ ضلع مائنرٹی ویلفیئر افسر جناب اقرار احمد نے بتایا کہ ایسے مدارس و مکاتب جو دینی علوم کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی کمیٹی کا اقلیتی فلاح و بہبود کے دفتر میں اندراج ہے، وہ اس اسکیم کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اساتذہ کی تقرری کا اختیار مدارس اور مکاتب کی کمیٹیوں کو دیا گیا ہے۔ ایسے اساتذہ کے لیے مطلوبہ مضامین کے ساتھ انٹرپاس ہونا کافی ہے۔ ایسے اساتذہ کو ضلع اقلیتی فلاح و بہبود کے دفتر کے ذریعے ہر ماہ تین ہزار روپیے دیے جائیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ ایسے مدارس و مکاتب جو اس اسکیم سے فائدہ اٹھائیں گے، ان کی بہتر کارکردگی کے پیشِ نظر ان کو آئندہ سرکاری گرانٹ دیے جانے کے بھی امکانات قوی ہیں۔ جناب اقرار احمد نے بتایا کہ دینی مدارس و مکاتب کے ذمّے داران اور علمائے کرام نے اس اسکیم کو پسند کرتے ہوئے درخواستیں دی ہیں جن میں سے بعض مدارس کو اس کے لیے منتخب بھی کر لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے بتایا کہ عربی فارسی بورڈ، الٰہ آباد کے نصاب کے تحت تحتانیہ درجات کی منظوری کا اختیار بھی ریاستی سرکار نے ضلع مائنارٹی افسر کو دے دیا ہے۔ یہ منظوری ملنے کے بعد تحتانیہ درجات کو پڑھانے والے معلم و معلمات کا ماہانہ مشاہرہ ریاستی سرکار دے گی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو تعلیمی کانفرنس

● علی گڑھ، 28/جولائی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر محمد زاہد نے حیدرآباد میں منعقد کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیرِ اہتمام 25ویں کل ہند کانفرنس کی سلور جوبلی تقریبات میں مسلم یونیورسٹی کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اور مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد زاہد نے اس دو روزہ کانفرنس میں قرارداد پیش کرتے ہوئے ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے یومِ پیدائش کو قومی یومِ تعلیم قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے پلاننگ کمیشن سے ہندستان میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے سو کروڑ روپیے مختص کرنے کی گزارش کی۔ اس دو روزہ کانفرنس میں حکومتِ ہند سے مطالبہ کیا گیا کہ دوردرشن سے قومی اور ریاستی سطح پر علاحدہ "اردو چینل" کا آغاز کیا جائے تاکہ اردو داں عوام کو قومی دھارے میں شامل رکھنے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے میں مدد مل سکے، جو جمہوریت اور سیکولرازم کے استحکام کا باعث ہوگا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا تھیٹر ورکشاپ

● بھوپال۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام بھارت وگیان سمیتی، آل انڈیا پیوپلس سائنس نیٹ ورک کے تعاون سے ملار موزی سنسکرتی بھون میں صبح 11 بجے ڈراموں پر ایک سات روزہ قومی ورکشاپ کا افتتاح اردو اکادمی کے صدر عزت مآب عزیز قریشی نے کیا۔ ورکشاپ کا موضوع "نیشنل کلا جتا تھیٹر ورکشاپ فار اسکرپٹ اینڈ میٹریل پروڈکشن ہے۔"، جس میں ڈراموں سے تعلق رکھنے والے مختلف زبانوں بشمول اردو کے دانشور شرکت کر رہے ہیں۔

جناب عزیز قریشی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ڈرامے کی شروعات یونان سے ہوئی۔ "ڈرا" یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی فرسٹ ایکٹ کے ہیں لیکن یونانی ڈرامہ ان کے دیوی دیوتاؤں کے آس پاس ہی گھومتا رہا اور ہندستان میں ڈرامے کی جڑیں پانچ سو قبل مسیح سے ہی کافی مضبوط رہی ہیں۔

اور آج الیکٹرانک میڈیا نے ڈرامے کو اس قدر عام اور مقبول بنا دیا ہے کہ پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی تخلیق چند ہی روز میں کشمیر سے کنیا کماری تک مشہور ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ اس ورکشاپ کے ذریعے ایسی تخلیقات منظر عام پر آنا چاہیے جو سادہ الفاظ میں عام آدمی تک پہنچ سکے۔

افتتاحی تقریب سے معروف فلم کار ایم. کے. رینا، نودر رینا، پروفیسر کملا پرشاد، کے. کے. کرشن کمار اور آشا مشرا نے بھی خطاب کیا۔ جناب ایم. کے. رینا نے کہا کہ کلچر نے آزادی کی جنگ میں اتنا ہی اہم رول ادا کیا ہے جتنا سیاستدانوں نے۔ پروفیسر کملا پرشاد نے کہا کہ سچ کو سچ بتانا ہوگا اور اس کے لیے عوام کے درمیان گھلنا ملنا پڑے گا، ان کی زبان کو اختیار کرنا پڑے گا تبھی سیکولرزم، جمہوریت اور امن قائم رہ سکے گا۔ شری کے. کے. کرشن کمار نے کہا کہ عوامی تحریک کا مقصد بڑے پیمانے پر مکالمہ کرنا ہے، اس کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں، گیت، ڈرامہ، پوسٹر بنائے جائیں۔ شکریہ کے فرائض مدھیہ پردیش جنوبی لوکھک سنگھ کے صدر پروفیسر آفاق احمد نے ادا کیے۔ (ڈاک سے)

پریم چند پر سیریل

● نئی دہلی، 28/جولائی۔ مشہور فلم ہدایت کار جناب گلزار ممتاز ادیب منشی پریم چند پر دوردرشن کے لیے ایک سیریل بنائیں گے۔ اطلاعات و نشریات کے وزیر جناب روی شنکر پرساد نے راجیہ سبھا میں یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ گلزار نے دوردرشن کے لیے پریم چند پر 26 قسطوں کا ایک سیریل بنانے کی رضامندی دے دی ہے۔

دوردرشن ذرائع کے مطابق جناب گلزار نے اس پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا ہے۔ اگر یہ سیریل کامیاب رہا تو اس کے مزید اپی سوڈ بنائے جائیں گے۔ اس سیریل کے ذریعے جناب گلزار تقریباً ایک دہائی کے بعد دوردرشن پر بطور ڈائرکٹر واپس آئے ہیں۔ 1980 کی دہائی میں جناب گلزار نے دوردرشن کے لیے 'مرزا غالب' سیریل تیار کیا تھا جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ (ہندستان ٹائمز، نئی دہلی)

ای ٹی وی اردو کے زیر اہتمام کل ہند شعری مقابلوں کا انعقاد

● ای ٹی وی اردو نے ایک نیا سلسلہ وار پروگرام ترتیب دیا ہے جس کا عنوان ہے "کل اور آئیں گے" اس پروگرام کے تحت ہر ریاست کے وہ نوجوان شعرا جن کی عمر پینتیس برس سے کم ہے اور جن کا ابھی تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے، اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

"کل اور آئیں گے" نوجوان شعرا کا سلسلہ وار مشاعرہ بھی ہے اور ان کے مابین کل ہند پیمانے کا ایک مقابلہ بھی۔ اس میں پہلے ہر اس ریاست میں جہاں اردو لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے، نوجوان شعرا کے مابین شعری مقابلوں کے ذریعے ایک بہترین شاعر یا شاعرہ کا انتخاب جج صاحبان کریں گے۔ جج کے فرائض مشہور و معروف اور مستند سینئر شعرا انجام دیں گے۔ ہر ریاست سے ایک بہترین شاعر یا شاعرہ کا انتخاب کرنے کے بعد گرانڈ فائنلز میں بہترین ریاستی شعرا کے درمیان شعری مقابلے ہوں گے اور کل ہند پیمانے کا بہترین شاعر منتخب کیا جائے گا۔ ہر ریاست کے بہترین شاعر کو ای ٹی وی اردو کی جانب سے انعامات دیے جائیں گے اور کل ہند سطح کے فاتح شاعر کا انعامات کے علاوہ مجموعہ کلام بھی ای ٹی وی اردو کی جانب سے شائع کیا جائے گا۔

ای ٹی وی اردو کے اس نئے اور دلچسپ سلسلہ وار پروگرام کی ابتدا ریاست مہاراشٹر سے کی جا رہی ہے جس میں مسلسل تیرہ ہفتوں تک نوجوان شعرا کے مابین مشاعرے / مقابلے ہوں گے، جن میں یہ نوجوان فن کار متفرق اشعار، قطعات، رباعیات اور طرحی و غیر طرحی غزلیں پیش کریں گے۔ اس کا ہر اپی سوڈ کسی نہ کسی عظیم شاعر کے نام سے معنون کیا گیا ہے جس میں ان کی حیات اور کارناموں کے حوالے سے انھیں خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ ریاست مہاراشٹر کے تیرہ اپی سوڈ کو غالب و میر سے لے کر مجروح و ساحر تک مختلف ادوار کے شعرا سے منسوب کیا گیا ہے۔

یہ دل چسپ پروگرام ای ٹی وی اردو پر ہر بدھ کو رات 8.00 بجے ہندستان میں اور شام 6.30 پر متحدہ عرب امارات میں دیکھا جا سکے گا۔

ریاست مہاراشٹر کے علاوہ دوسری ریاستوں کے وہ نوجوان شعرا جو درج بالا شرائط پر پورے اترتے ہوں اور ان مقابلوں میں شرکت کے خواہش مند ہوں وہ اپنا بایوڈاٹا، پوسٹ کارڈ سائز تصویر، نمونہ کلام کے طور پر چند متفرق اشعار، قطعات، رباعیات اور دو غزلیں درج ذیل پتے پر روانہ کر سکتے ہیں۔ نیز "کل اور آئیں گے" کے اگلے مقابلوں کی شوٹنگ لکھنؤ میں ہوگی جس میں اتر پردیش کے نوجوان شعرا حصہ لیں گے۔

پتہ: "کل اور آئیں گے"

ای ٹی وی اردو

راموجی راؤ فلم سٹی، حیدر آباد 501512 (ڈاک سے)

'مسلم انڈیا' دوبارہ منظر عام پر

● نئی دہلی۔ سات مہینے کے وقفے کے بعد مسلم انڈیا (Muslim India) اس ہفتے دوبارہ منظر عام پر آگیا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کو اُجاگر کرنے والا اور ان پر تحقیقی مضامین پیش کرنے والا یہ انگریزی جریدہ

بیس سال سے نگاتار شائع ہو رہا تھا لیکن دسمبر 2002 کے بعد سے اس کی اشاعت منقطع ہو گئی تھی۔

مسلم انڈیا کے بانی ایڈیٹر جناب سیّد شہاب الدین مسلمانوں کے معروف لیڈر ہیں۔ وہ میں سال سے اس میگزین کے ذریعے مسلمانوں کے مسائل ہندستانی طبقہ خواص کے سامنے پیش کر رہے تھے، لیکن بڑھتی ہوئی عمر، گھٹتی ہوئی طاقت و توانائی، قارئین کی عدم دلچسپی، گرتی اشاعت اور روز افزوں مالی دشواریوں کی وجہ سے انھوں نے بذاتِ خود اس کی اشاعت بند کر کے اس کی ذمّے داری مسلمانوں کے دوسرے انگریزی ترجمان "ملی گزٹ" (The Milli Gazette) کے سپرد کر دی جس کے بانی ایڈیٹر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ہیں۔ اس اخبار کے مدیر ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ایک اعلا تعلیم یافتہ دانشور اور مشرقِ وسطیٰ اور عرب امور کے ماہر ہیں۔

'مسلم انڈیا' کی اشاعتِ جدید کا یہ شمارہ 628 صفحات پر مشتمل ایک خصوصی نمبر ہے۔ اس میں نومبر 2002 سے لے کر مئی 2003 تک کے واقعات و مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔ مزید برآں نئی مطبوعات پر تبصرے اور مختلف مسائل پر مضامین بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ اس خصوصی شمارے کی قیمت 200 روپے ہے۔ (ڈاک سے)

چنڈی گڑھ میں ساہتیہ اکادمی کی نمائشِ کتب

● چنڈی گڑھ، 25/جولائی۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے علاقائی زبانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے علاقائی زبانوں کی مطبوعات کی نمائش چنڈی گڑھ میں لگائی۔ اکادمی فی الحال ملک کی 22 زبانوں میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔ نمائش میں پنجابی، ہندی، اردو اور انگریزی کی کتابیں لگائی گئیں۔

اکادمی کے نمائندے جناب پردیپ چھابڑا نے تسلیم کیا کہ عالم کاری نے لوگوں کی توجہ انگریزی کی طرف مبذول کر دی ہے۔ مغربی بنگال اور کیرالہ جیسے کچھ علاقوں میں صورتِ حال بہتر ہے، جہاں اب بھی علاقائی زبانوں میں ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اس غیر صحت مند رجحان کو بدلنے کے لیے ساہتیہ اکادمی ملکی زبانوں کی مطبوعات پر پچاس فیصد رعایت دے رہی ہے۔ جگہ جگہ بک کلب قائم کیے جا رہے ہیں اور کتابوں کی نمائش لگائی جا رہی ہیں۔ چنڈی گڑھ کی نمائش میں پنجابی کی 300 اور اردو کی 350 کتابیں لگائی گئیں۔ یہ نمائش چنڈی گڑھ میں 26 جولائی تک چلی۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

اردو میڈیم طلبہ کی نمایاں کارکردگی

● پونے: 23/جون۔ ایس ایس سی بورڈ امتحان میں جہاں واجدہ محمد اسمٰعیل کارنگر نے پورے پونے ڈویژن (احمد نگر، سولاپور شہروں سمیت) میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور اردو کا پرچم بلند رکھا اور دسویں جماعت میں کامیابی کا سلسلہ برقرار رکھا تو اس خوشی اور مسرت کے دوران اہلِ اردو کے لیے ایک خوش آئند خبر پمپری پنچوڑ سے آئی جب نیشنل اردو ہائی اسکول پمپری کھردوا ڑی کی ہندو طالبہ پریا نیشور لانڈے نے ایس ایس سی میں اردو میڈیم سے 62.13 فیصد نمبروں کے ساتھ فرسٹ کلاس میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے سبھی کو انگشت بدنداں کر دیا۔

شاید پریا لانڈے مہاراشٹر کی واحد ہندو لڑکی ہے جو اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ پریا مراٹھی غلبہ والے علاقے بھوسری سے تعلق رکھتی ہے۔ پریا کے والد نیشور دگڑو پنچو چلاتے ہیں۔ محلّہ کے قریبی مسلمانوں کے اصرار پر انھوں نے پریا کو بغیر کسی بھید بھاؤ کے اردو بال واڑی میں داخل کیا۔ بچپن سے ہی ذہین پریا نے ساتویں جماعت کی تعلیم پمپری پنچوڑ کے میونسپل کارپوریشن راجیو گاندھی اسکول میں حاصل کی۔ آٹھویں اور نویں جماعت میں اس نے نیشنل اردو ہائی اسکول پمپری کھردوا ڑی میں نمایاں نمبرات حاصل کیے۔ پریا لانڈے مستقبل میں پولیس انسپکٹر بننا چاہتی ہے تاکہ سماج سے ظلم و ستم کو مٹا کر ایک مہذب سماج قائم کیا جا سکے۔ نیشنل اردو ہائی اسکول کا امسال کا نتیجہ صد فی صد رہا ہے۔ پریا لانڈے کے علاوہ سائرہ خان انسان علی 74.66%، گڈو باشا 64.44%، شاکر حسین محرم 64.13% سے کامیاب ہوئے۔ (ڈاک سے)

بہار میں اردو اساتذہ کے لیے کوٹہ مقرر

● پٹنہ، 23/جولائی۔ بہار سرکار نے ریاست کے پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں اساتذہ کی آئندہ تقرری میں نصف اسامیاں خواتین کے لیے مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریاستی کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ اب ریاست میں ٹیچروں کی جتنی تقرریاں ہوں گی، ان میں سے دس فی صد اردو ٹیچروں کے لیے محفوظ ہوں گی۔ خواتین کے کوٹے کا اطلاق اردو اساتذہ پر بھی ہوگا۔ ٹیچروں کو چار زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ہیں: مرد اساتذہ، خاتون اساتذہ، اردو مرد اساتذہ، اردو خاتون اساتذہ۔ تقرریاں ضلع سطح سے منظوری کے بعد اسٹاف سلیکشن کمیشن کے توسط سے ہوں گی۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

چھتیس گڑھ میں یونانی میڈیکل کالج کا افتتاح

● رائے پور، 23/جون۔ چھتیس گڑھ کے پہلے یونانی میڈیکل کالج کا افتتاح عالی جناب اجیت جوگی (وزیرِ اعلا، چھتیس گڑھ) کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقعے پر جناب بی. پی. چندرا (وائس چانسلر، روی شنکر یونیورسٹی، رائے پور)

قاضی اقلیم الدین (سکریٹری ودھان سبھا) جناب محمود علی فاروقی (صدر سوسائٹی) جناب حسن خاں (چیئرمین، مدرسہ بورڈ چھتیس گڑھ) جناب ایم. اے. مدنی، ڈاکٹر عبدالرزاق وغیرہ اسٹیج پر موجود تھے۔

یونانی میڈیکل کالج سی. سی. آئی. ایم. دہلی اور ریاستی حکومت چھتیس گڑھ اور روی شنکر یونیورسٹی رائے پور سے ملحق ہے۔ اس میں کل چالیس سیٹیں ہیں۔ یہ ساڑھے پانچ سال کا کورس ہے جس میں ہر ڈیڑھ سال میں امتحان ہوگا۔

افتتاح کے موقعے پر وزیر اعلا نے کالج کے لیے زمین اور ایک لاکھ روپے کا سامان بھی دینے کا وعدہ کیا اور چھتیس گڑھ کے باہر کے طلبہ کو بھی داخلے کی اجازت دی۔ چھتیس گڑھ میں قدرتی جڑی بوٹیاں کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یونانی کالج کو کام کرنے میں اور آسانیاں ہوں گی۔

اس موقعے پر محمد سلیم اشرفی، شیخ ناظم الدین، محمد شفیق قریشی، عبدالحمید حیات اور کثیر تعداد میں چھتیس گڑھ صوبے کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ اخیر میں مولانا اکبر علی فاروقی (چیئرمین، یونانی میڈیکل کالج) نے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

'یومِ کبیر' کا انعقاد

● جودھپور، 15/جون۔ بزم اردو، جودھپور، کی جانب سے 'یومِ کبیر' کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کرپا کشن رندی نے کی۔ مہمانِ خصوصی قاضی محمد ایوب انصاری اور مہمانِ امتیازی بزرگ شاعر جناب منظر القادری تھے۔ اس موقعے پر مشہور شاعر اور نقاد شمین کاف نظام نے کہا کہ "کبیر پہلا شاعر ہے جو زندگی کے مسائل کا حل فلسفے کے بجائے محبت میں تلاش کرنے کا درس دیتا ہے۔ اپنے دوہوں کی روشنی میں وہ نہ مسلمان، وہ صرف انسان ہے اور انسانیت کا پیغام دیتا ہے۔" ڈاکٹر نثار راہی نے "دوہا اور کبیر۔ چند سوال" کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ کبیر پر از سر نو تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ کبیر، تلسی، رحیم، جائسی اور نظیر جیسے مقامی زبانوں کے شعرا کو ہمارے تذکرہ نگاروں نے خاطر خواہ اہمیت نہیں دی۔ بر جیش عنبر نے "کبیر ایک مشتبہ شاعر" کے حوالے سے کہا کہ "کبیر پنڈت اور ملاؤں دونوں کے دکھاوے پن پر طنز کرتا ہے۔"

اس موقعے پر ایک شعری نشست کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں دوہوں کے ذریعے کبیر کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ نشست میں شمین کاف نظام، اے. ڈی. راہی، کرپا کشن رندی، سر فراز شاکر، شمین میم حنیف، ڈاکٹر نثار راہی، محمد افضل جودھپوری، اشراق الاسلام باہر، بر جیش عنبر اور الفت شاکر نے شرکت کی۔ اجلاس میں مشہور شاعر امیر آغا قزلباش، ابنِ فرید اور سالک بیکانیری کے انتقال پر خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ بزم کی جانب سے ڈاکٹر نثار راہی نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت اشراق الاسلام باہر نے کی۔ (ڈاک سے)

گجراتی کے شاعر راجندر شاہ کو گیان پیٹھ ایوارڈ

● نئی دہلی، 17/جولائی۔ ملک میں ادب کا سب سے بڑا انعام "گیان پیٹھ ایوارڈ" اس سال گجراتی زبان کے بزرگ اور ممتاز شاعر جناب راجندر کیشو لال شاہ کو دیا جائے گا۔ اس کا اعلان گیان پیٹھ ایوارڈ کے انتخابی بورڈ نے کیا۔

بھارتیہ گیان پیٹھ کی جانب سے یہ ایوارڈ ہر سال ملک کے کسی غیر معمولی شاعر یا ادیب کو دیا جاتا ہے۔ ایوارڈ کی رقم پانچ لاکھ روپے ہے۔ جناب راجندر کیشو لال شاہ کو ملنے والا یہ 37واں گیان پیٹھ ایوارڈ ہوگا۔

جناب راجندر شاہ کا جنم 1913 میں گجرات کے کیرا ضلع کے کپودنج میں ہوا تھا۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ راجندر شاہ نے پہلی نظم 1933 میں لکھی۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "دھوپنی" 1951 میں شائع ہوا۔ اب تک ان کی 21 کتابیں شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکی ہیں۔ راجندر شاہ کو ساہتیہ اکادمی سمیت کئی انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کی شاعری معاشرے کے تئیں ایک فرد کی ذمے داری کو اُجاگر کرتی ہے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

شمس الرحمان فاروقی کے اعزاز میں جلسہ

● گورکھپور، 22/جولائی۔ "چند لمحے شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ" کے زیر عنوان ساجد علی میموریل کمیٹی کا ایک خصوصی ادبی جلسہ گزشتہ دنوں جناب ایم کوٹھیاوی راہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب محبوب سعید نے جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کمیٹی کی ادبی کارگزاریوں کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر جناب ایم. کوٹھیاوی راہی نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی ہندستان میں جدیدیت اور نئی تنقید کے بانی اور منفرد ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔ جب ترقی پسند تحریک پر جمود طاری ہونے لگا تھا، ایسے میں فاروقی صاحب نے جدیدیت کو تحریک کے طور پر پیش کر کے اس جمود کو توڑا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادیبوں کو آزاد خیال ہونا چاہیے اور انھیں ہر جگہ علم کی روشنی پھیلانی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ میں شروع سے ادیب کی مکمل آزادی کا حامی ہوں، کسی دستور العمل کا پابند نہیں۔ جدیدیت نئے خیالات اور اپنے ضمیر اور باطن کی آزادی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اردو کی موجودہ صورتِ حال کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ اس میں آپ لوگوں کی بے حسی شامل ہے۔ معاشرے یا زبان کو نقصان پہنچانے والا اور کوئی نہیں ہے۔ چاہے کالج ہو یا یونیورسٹی، چار جملے صحیح لکھنے والے نہیں ملتے۔

انھوں نے کہا کہ ہماری نئی نسلوں کو اس پر توجہ دینی چاہیے۔

اس موقعے پر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر افضال اللہ خاں نے فاروقی صاحب کی شاعری، تنقید اور افسانہ نگاری کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے۔ جلسے میں مہمانِ خصوصی کے طور پر کمیٹی کے سرپرست عالی محمد حامد علی، پروفیسر احمد لاری اور انجینئر شمس انور سمیت متعدد افراد موجود تھے۔ (سازوکن، حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو ہند میں استقبالیہ تقریب

● نئی دہلی، 29 رجولائی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) میں منعقد اعزازی جلسے میں برمنگھم (برطانیہ) سے آئے ادیب اور شاعر عاشور کاظمی کا استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ برطانیہ میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ میں اردو کا ایک خادم ہوں اور بزرگوں کی رہنمائی میں اردو کے لیے کام کرتا رہوں گا۔ انھوں نے بتایا کہ ستمبر سے دسمبر 2003 تک لندن اور یورپ کے تقریباً تمام ملکوں میں جشنِ اردو منعقد کیا جائے گا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور نظامت نور جہاں ثروت نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر پروفیسر قمر رئیس نے شرکت کی۔ جناب خلیق انجم نے تعارفی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یورپ میں اردو کے کسی ادبی کام کی تکمیل عاشور کاظمی کے حوالے کے بغیر ممکن نہیں۔ جناب علی احمد فاطمی نے کہا کہ عمر، صحت اور نکتہ چینی کی پروا کیے بغیر اردو کی خدمت کرتے رہنا ان کا ایک کارنامہ ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عاشور کاظمی مغرب میں مشرق کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ وہ علمی قوت کے حامل، تنظیمی صلاحیت کے مالک اور اردو سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حالانکہ عاشور کاظمی پانی پت کے قریب ایک قصبے میں پیدا ہوئے اور اب برطانیہ میں مقیم ہیں لیکن میں انھیں دہلی سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو کے لیے ان کی خدمات کا تذکرہ کیا اور دعا کی کہ اردو کی ماحول سازی کی مساعی میں کامیاب ہوں۔ علاوہ ازیں مشتاق احمد ایڈووکیٹ اور جی ڈی چندن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذکی طارق کے اظہارِ تشکر کے ساتھ جلسے کا اختتام ہوا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جے۔ این۔ یو میں مذاکرہ

● نئی دہلی، 22 رجولائی۔ ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر کی کتاب "اختر الایمان — تفہیم و تشخص" کے حوالے سے جے این یو میں آج ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر انور پاشا اور ڈاکٹر خواجہ اکرام نے کی اور سرور الہدیٰ نے نظامت کی۔ ڈاکٹر پاشا نے کتاب کے سلسلے میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت حوصلہ افزا ہے کہ اختر الایمان پر ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ایک بھرپور کام کیا گیا ہے۔ انھوں نے اختر الایمان کی شاعری، ان کے عہد اور معاصرین کے حوالے سے اس کتاب کا جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے کہا کہ اختر الایمان رفتہ رفتہ ہمارے عہد کا حوالہ بنتے جا رہے ہیں اور ہر سنجیدہ قاری دوسرے شعرا کے مقابلے ان کی طرف متوجہ ہو رہا ہے جس کی بہترین مثال نسیم اختر کی تازہ ترین کتاب ہے۔ اس پروگرام میں ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اور فارسی کی مشترکہ نشست

● گزشتہ دنوں ممبئی کے علاقہ باندرہ میں واقع "لکی ہوٹل" میں "اردو لٹریری فورم" کی طرف سے ایران سے تشریف لائے فارسی اور اردو کے شعرا کی ایک مشترکہ شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس نشست کی صدارت مشہور طنز و مزاح نگار جناب یوسف ناظم اور نظامت جناب جاوید ندیم نے کی۔ فارسی کے ایرانی شعرا ڈاکٹر حمید فرزام، ڈاکٹر امیر محمود انوار، ڈاکٹر علی محمد موذنی، ڈاکٹر حسن رضا باغ بیدی اور ڈاکٹر عبدالرضا سیف نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

اس تقریب میں ندا فاضلی، گنیش بہاری طرز، عبدالاحد ساز، ڈاکٹر شفیع ساغر، نسیم سہارنپوری، م. ناگ، فرحان حنیف، قمر صدیقی، عبید اعظم اعظمی اور محمد قیوم نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

قاری محمد میاں مظہری
مدرسہ ایجوکیشن کونسل کے صدر منتخب

● نئی دہلی، 19 رجولائی۔ اسلامک کونسل آف انڈیا کے سربراہ قاری محمد میاں مظہری کو مدارسِ اسلامیہ کی بقا اور ترقی کے لیے تشکیل کردہ مدرسہ ایجوکیشن کونسل کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اسلامی تعلیمی بورڈ کے سربراہ شیخ ابوبکر قادری، قاضی شہر کانپور مولانا قاری عبدالسمیع اور ممتاز صنعت کار سراج قریشی کونسل کے سرپرست منتخب کیے گئے ہیں۔

ملک کی مختلف ریاستوں کے تقریباً سو علما و مشائخ اور مدارس کے نمائندگان کے اجلاس میں مدارس کو قدیم و جدید علوم کا مشترکہ مرکز بنانے اور کمپیوٹر کاری کے ذریعے ان کی جدید کاری کے لیے اتفاقِ رائے سے کونسل

قائم کی گئی۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

سید عبدالرافع کی صحافتی خدمات کا اعتراف

● حاجی پور، 30/جون۔ "اردو زبان وادب کی ترقی اور اس کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ اردو صحافت بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ زبان و ادب کے اس شعبے اور اس سے وابستہ افراد کو وہ اہمیت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ جمود ٹوٹ رہا ہے اور یہ بات محسوس کی جانے لگی ہے کہ اردو کے فروغ اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں اردو صحافیوں کی خدمات کسی دوسرے سے کم نہیں ہیں۔" ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز صحافی جناب سید عبدالرافع مدیر اعلا ہفت روزہ "نقیب" پٹنہ نے 29/جون کو انجمن ترقی اردو ویشالی (بہار) کی جانب سے اپنے اعزاز میں منعقدہ جلسے میں کیا۔ جلسے کے صدر معروف ادیب و شاعر پروفیسر ثوبان فاروقی نے اس موقعے پر اپنے صدارتی کلمات میں عبدالرافع صاحب کی طویل صحافتی خدمات کا احاطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں عبدالرافع صاحب جیسے لوگ نمونہ ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے دم سے آج اردو صحافت زندہ ہے۔ صحافی ڈاکٹر ریحان غنی (پٹنہ) نے اس موقعے پر اپنے تاثرات میں کہا کہ اردو اخبارات جس زبوں حالی کا شکار ہیں، ایسے میں اگر کوئی شخص اردو صحافت میں اپنی زندگی گزار دیتا ہے تو یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی تمام تنگ دامانیوں کے باوجود عبدالرافع صاحب گزشتہ تینتالیس برسوں سے اس پیشے سے وابستہ ہیں۔ کلکتہ سے لے کر پٹنہ تک کے کئی اخبارات ان کی خدمات کا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صدر انجمن پٹنہ اور معروف سماجی وسیاسی لیڈر الحاج محمد منیف نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ عارف حسن وسطوی نے اپنے مقالے "عبدالرافع۔ ایک تعارف" میں کہا کہ جناب عبدالرافع نے صحافت کے ذریعے اردو کی خدمت اور قوم و ملت کی رہنمائی جس طرح کی ہے وہ قابلِ قدر ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہے۔ جلسے کی نظامت انوار الحسن وسطوی نے فرمائی جبکہ شکریہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے پیش کیا۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● مئوناتھ بھنجن، 10/جون۔ "موجودہ عالمی منظر نامہ حوصلہ شکن بھی ہے اور تشویشناک بھی، لیکن تاریخ کے طویل سفر میں یہ کوئی پہلا مرحلہ نہیں ہے اس لیے ہمیں بہت زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یورپ اور امریکہ نے یہ ساری ترقی جدید تعلیم کے ذریعے ہی کی ہے۔" ان خیالات کا اظہار جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے ریسرچ اسکالر اطہر افضال نے فردوس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک مباحثے کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مدارس اور اسکولوں کی اہمیت وافادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جہاں عصری تعلیم گاہیں کم ہوں، وہاں نئے اسکول کھولے جائیں۔ اور جہاں مدارس و مکاتب کی ضرورت ہو، وہاں مدارس اور اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے نائب جنرل سکریٹری ایم عبدالرحمٰن نے فردوس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کا مکمل تعارف پیش کیا۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری شفیق الرحمٰن نے بتایا کہ سوسائٹی کا اصل مقصد تعلیم وتعلم کی اہمیت کو اُجاگر کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مدارس کے وہ فارغین جو امامت وخطابت اور درس وتدریس سے گھبراتے ہیں، انھیں جدید تعلیم کے حصول کے لیے آگے آنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہائی اسکول اور انٹر کے نتائج آنے والے ہیں، امسال سوسائٹی کی طرف سے مئوشہر کے جملہ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے مسلم طلبہ و طالبات جو اپنے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کریں گے، انھیں نشانِ امتیاز اور انعامات سے نوازا جائے گا۔ آخر میں ایم عزیز الرحمٰن نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ مباحثے کے شرکا میں راشد جمال ندوی، عبدالرحمٰن، خالد، راشد اخلاق اور فہد خورشید وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ (ڈاک سے)

● آرہ، 13/جولائی۔ ادارہ تزئینِ ادب آرہ کی پچاسویں نشست ادارے کے معمر رکن جناب سرفراز اشہر کے احاطہ واقع محلہ ملکی آرہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت بزرگ شاعر و محقق جناب ش. م. عارف ماہر آروی نے کی اور نظامت کے فرائض مشکور معینی نے انجام دیے۔ نشست کا باضابطہ آغاز جناب سہیل ارحم کی نعتِ پاک سے ہوا۔ بزرگ شاعر جناب شمیم یوسفی، جناب فضل الرحمٰن احمر، جناب جلال الدین انصاری، جناب قربان آتش، جناب رحمت علی رحمت، جناب اقبال مجروح، امتیاز احمد دانش، سعید اختر، عطاء الرحمٰن عطا اور امان اللہ راغب کی مساعی سے یہ ادارہ 16/اگست 1998 کو وجود میں آیا اور تندہی سے علم وادب کی خدمت میں معروف ہے۔ جناب ریاض الدین رضا، سہیل ارحم، مشکور معینی، عطاء الرحمٰن عطا، امتیاز احمد دانش، اسرار عالم سیفی، سرفراز اشہر، رسک بھوجپوری، قربان آتش، رام ناتھ دیو، م. آصف آروی، غلام رسول کیفی، اے کمار آنسو، شمیم یوسفی، احمر آروی و جناب ش. م. عارف ماہر آروی نے اس نشست میں اپنے کلام سے نوازا۔

بعد ازاں مشہور شاعر جناب عبدالرب جاوید اور ہندی کے مشہور ادیب جناب بھیشم ساہنی کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج وملال کا اظہار کرتے ہوئے ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ جناب امتیاز احمد دانش کے اظہارِ تشکر کے ساتھ یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔ (ڈاک سے)

● ممبئی، 8/جون۔ ممبئی کے نزدیکی شہر میرا روڈ میں واقع جناب شمیم

عباس کی رہائش گاہ پر افسانوں اور شاعری کی ایک ملی جلی ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ نشست کے پہلے سیشن کی صدارت نامور افسانہ نگار جناب علی امام نقوی نے کی۔ اس موقعے پر مشہور افسانہ نگار جناب سلام بن رزاق اور نوجوان افسانہ نگار رحمان عباس نے اپنی کہانیاں پیش کیں اور شرکا نے ان کی کہانیوں پر گفتگو کی۔

شعری حصے کی صدارت جناب یعقوب راہی نے انجام دی اور اس میں ندا فاضلی، عبدالاحد ساز، شمیم عباس، فاروق آشنا، الیاس شوقی، حامد اقبال صدیقی، فرحان حنیف اور قمر صدیقی کے علاوہ جناب یعقوب راہی نے بھی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ اردو اکیڈمی کے ایگزیکٹیو آفیسر اور مترجم وقار قادری بھی پروگرام شریک تھے۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 8/ جولائی۔ اردو اکادمی کے سہ روزہ ادبی اجتماع "نئے پرانے چراغ" کے پہلے روز تیسرے اجلاس میں محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت گلزار دہلوی نے کی اور نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ مشاعرے میں جناب گلزار دہلوی، جناب وقار مانوی، جناب تابش مہدی، جناب سہیل فاروقی، جناب متین امروہوی، ڈاکٹر شہپر رسول، جناب خالد محمود، جناب ماجد دیوبندی، جناب حاصل سنبھلی، جناب حسن کاظمی، جناب سلیم صدیقی، جناب معین شاداب، جناب شاداں رامپوری، محترمہ اشرف جہاں صبوحی، جناب منور حسن کمال، جناب اظہار ہاشمی، جناب عمیر منظر، جناب ظفر شاداب اور جناب طاہر عرش نے اپنا کلام پیش کیا۔

● "نئے پرانے چراغ" کے تحت دوسرے دن 7/ جولائی کو تیسرے اجلاس میں منعقد مشاعرے کی صدارت جناب مخمور سعیدی نے کی اور نظامت کے فرائض قمر سنبھلی نے انجام دیے۔ اس میں جناب مخمور سعیدی کے علاوہ جناب نسیم مخموری، جناب واجد سحری، جناب ابرار کرتپوری، جناب عابد کرہانی، جناب طالب رامپوری، جناب قمر سنبھلی، جناب سہیل ثاقب، جناب اقبال اشہر، جناب اعجاز انصاری، جناب ظہیر رحمتی، جناب رئیس انجینئر اور جناب قاصر سہسوانی نے اپنے کلام سے نوازا۔

آخری دن کے مشاعرے کی صدارت جناب زبیر رضوی نے کی اور شہباز ندیم ضیائی کی نظامت میں محفلِ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں حسبِ ذیل شعرا نے کلام پیش کیا۔ جناب زبیر رضوی، جناب نظمی سکندر آبادی، جناب انتظار نعیم، ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، محترمہ نور جہاں ثروت، جناب سلیم شیرازی، جناب شہباز ندیم ضیائی، جناب رؤف رضا، محترمہ راشدہ باقی حیا، جناب انقلاب سرسوی، جناب مخدوم زادہ مختار عثمانی، جناب اقبال فردوسی، جناب رضا امروہوی، جناب سیف سحری، جناب جاوید، جناب عمران عظیم، جناب صالحین فہمی، جناب راشد علی شفا اور جناب چاند فیضی۔ آخر میں سکریٹری اردو اکادمی مرغوب حیدر عابدی نے تمام مہمانوں، شعرا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسمِ اجرا

آخری ساعت سے پہلے

● بنگلور، 20/ جولائی۔ اردو کے معروف شاعر جناب حمید الماس کی شعری کتاب "آخری ساعت سے پہلے" کا اجرا کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ ایک جلسے میں اردو کے ممتاز صحافی اور شاعر جناب راز امتیاز نے انجام دیا۔

اس موقعے پر جناب راز امتیاز نے حمید الماس کی شخصیت اور ان کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حمید الماس برِصغیر کے اخبارات و رسائل میں کرناٹک کے سب سے زیادہ شائع ہونے والے شاعر تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حمید الماس نے اپنی زندگی کے ہر نجی واقعے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کا شاعرانہ کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بے پناہ خلاقانہ صلاحیت سے کام لے کر نجی تجربے کو اس طرح آفاقیت عطا کر دی کہ قاری ایک روحانی مسرت سے سرشار ہوتا ہے۔

مہمانِ خصوصی اردو کے معروف شاعر اور مترجم جناب مظفر مجاز نے "آخری ساعت سے پہلے" کے حوالے سے حمید الماس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی اور اہم خوبی ان کی امیجری ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ اور جاندار و بامعنی تراکیب کی مدد سے خوب صورت پیکر تراشتے ہیں۔ چنانچہ اختصار ان کی نظموں کا حسن ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ اختصار کے باوجود ان کی نظمیں اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہیں۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

جانی واکر

● ممبئی، 29/ جولائی۔ اپنے عہد کے مقبول ترین کامیڈی اداکار جانی واکر کا آج طویل علالت کے بعد مغربی ممبئی میں ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ وہ 79 برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوی، تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ جانی واکر کو جن کا اصل نام بدرالدین جمال الدین قاضی تھا، آج شام ساڑھے چھ بجے ماہم کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جنازے میں دلیپ کمار، سنیل دت اور گووندا شریک تھے۔ اپنے عہد کے مشہور مزاحیہ اداکار جانی واکر کو شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دلیپ کمار نے کہا

کہ وہ ایک عزیز دوست اور فلمی دنیا ایک عظیم فنکار سے محروم ہو گئی ہے۔

1923 میں 15/ مئی کو کشمیر میں ایک مل ورکر کے یہاں پیدا ہونے والے جانی واکر کا خاندان بعد ازاں اندور منتقل ہو گیا تھا جہاں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق انھیں ممبئی لے آیا اور یہاں انھوں نے بس کنڈکٹر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ بس میں وہ کچھ مسافروں کو ہنسا رہے تھے کہ اداکار بلراج ساہنی کی ان پر نظر پڑ گئی۔ اس وقت بلراج ساہنی فلم 'بازی' کے لیے اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ انھوں نے جانی واکر سے کہا کہ وہ ہدایت کار گرودت سے مل لیں۔ ایک روز شرابی کی نقل کرتے ہوئے وہ گرودت کے پاس پہنچے۔ گرودت کو ان کا یہ انداز اس قدر اچھا لگا کہ انھوں نے فلم 'بازی' کے لیے انھیں منتخب کر لیا۔ گرودت نے ہی ان کا نام مشہور اسکاچ برانڈ کے نام پر 'جانی واکر' رکھا۔ یہ واقعہ 1951 کا ہے۔ پردے پر آنے کے بعد جانی واکر فلم بینوں کے ذہنوں میں بس گئے اور برسوں اپنی روایتی ٹوپی اور مزاحیہ اداکاری سے لوگوں کے دلوں پر راج کرتے رہے۔ ان کے بعد کے بہت سارے مزاحیہ اداکاروں نے ان کے انداز کو اپنایا۔ گرودت کی ہی فلم CID میں جانی واکر کا رول آج بھی لوگ نہیں بھولے۔ فلموں کے شائقین آج بھی جانی واکر کو ان کے مقبول عام گانوں کے حوالے سے یاد کرتے ہیں مثلاً فلم "پیاسا" کا یہ گانا نئی نسل بھی گاتی ہے 'سر جو ترا چکرائے یا دل ڈوبا جائے'۔ CID کے اس گانے کو تو جانی واکر نے واقعی امر کر دیا:

اے دل ہے مشکل جینا یہاں ذرا ہٹ کے ذرا بچ کے
یہ ہے بامبے میری جاں

1956 کی 'چھو منتر' جیسی فلموں میں جانی واکر کا کردار ہیرو (کرن دیوان) سے زیادہ اہم رہا۔ جانی واکر نے تقریباً تیس برسوں تک کامیڈین کی حیثیت سے پردہ سیمیں پر اپنی الگ پہچان قائم رکھی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بیگم رشید احمد صدیقی

● علی گڑھ، 8/ جولائی۔ اردو کے مشہور ادیب و طنز نگار اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بیگم جمیلہ خاتون کا 93 سال کی عمر میں 5/ جون کو شام ساڑھے چار بجے انتقال ہو گیا۔ وائس چانسلر نسیم احمد نے بیگم رشید احمد صدیقی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کے جنازے میں شرکت کی۔ مرحومہ یونیورسٹی کیمپس کی معمر ترین خاتون تھیں۔ وہ اپنی خوش مزاجی اور وجاہت کی وجہ سے ہر دلعزیز اور معزز شخصیت کی مالک تھیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا 15/ جون 1977 کو انتقال ہوا تھا۔ پسماندگان میں ان کے بیٹے اقبال رشید صدیقی، نیازی رشید صدیقی اور اکبر رشید صدیقی، دو بیٹیاں مشہور افسانہ نگار سلمیٰ صدیقی اور عذرا جلال ہیں۔ پروفیسر احسان رشید صدیقی سابق سفیر جارڈن اور سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کا گذشتہ سال انتقال ہو گیا تھا جو ان کے بیٹے تھے۔ اقبال رشید صدیقی، نیازی رشید صدیقی اور عذرا جلال پاکستان میں رہتے ہیں۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

مولانا سردار شاہ خاں وجیہی

● رام پور۔ ممتاز عالم اور مصنف مولانا سردار شاہ خاں وجیہی کا 9/ مئی کو رام پور میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی ولادت 1919 میں رام پور کے معزز اور صاحبِ علم گھرانے میں ہوئی تھی۔ حفظِ قرآن پاک کے بعد انھوں نے ریاستِ رام پور کے مڈل اسکول میں تعلیم حاصل کی اور ریاست میں ہی مختلف عہدوں پر ملازم بھی رہے۔ اسی کے ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا اور الٰہ آباد بورڈ سے فاضل کی سند بھی حاصل کی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی باقی زندگی مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ، رامپور کے لیے وقف کر دی تھی۔ مذکورہ مدرسے میں درس و تدریس کے علاوہ الادارۃ الشرعیہ کے سکریٹری بھی رہے۔ وہ بہترین خطیب اور ماہر درسیات ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نثر نگار بھی تھے۔ مرحوم اصلاحی مضامین کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ (ڈاک سے)

بھیشم ساہنی کو خراجِ عقیدت

● 16/ جولائی۔ ہندی کے مشہور و معروف ادیب بھیشم ساہنی کے انتقال پر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر صادق، صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی نے کی۔ پروفیسر صادق نے اپنی تعزیتی تقریر میں بھیشم ساہنی کے انتقال کو ہندستانی ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ بھیشم ساہنی ناول نگار، افسانہ نگار، اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ہندی ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقی نگارشات تعصبات سے پاک ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی فن پاروں کے وسیلے سے جہاں بنی نوع انسان کے کرب کا اظہار کیا وہیں ہندستانی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ کیمونزم کو بے نقاب بھی کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے نام بھیشم ساہنی کے اردو خط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھیشم ساہنی اردو زبان و ادب سے بخوبی واقف تھے اور اپنی اداکاری اور تھیٹر کی زندگی میں اسے عملاً برتتے بھی تھے۔ وہ ادب کو انسانی رشتوں کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں عصری حسیات جھلکتی ہیں۔ ڈاکٹر ابنِ کنول اور ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے بھی بھیشم ساہنی کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔

اس تعزیتی نشست میں شعبۂ اردو کے اساتذہ کے علاوہ بہت سے طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

تبصرہ وتعارف

مثنوی بہرام وگل اندام / شاعر: طبعی گولکنڈوی

مرتب: ڈاکٹر نورالسعید اختر

صفحات: 236، قیمت: 68روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمور سعیدی

بہرام اور گل اندام کا قصہ اردو اور فارسی، بالخصوص فارسی شعر وادب کے مقبول ترین قصوں میں سے ہے جسے کئی چھوٹے بڑے شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان میں فردوسی، طوسی، نظامی گنجوی، خواجو کرمانی اور امیر خسرو جیسی نابغہ روزگار ہستیاں بھی شامل ہیں۔ ان میں فردوسی کو اوّلیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے "شاہنامہ" میں بہرام گور کی داستان بیان کی ہے۔ نظامی گنجوی، خواجو کرمانی، امیر خسرو اور بعض دیگر شعرا نے اس داستان میں فلسفیانہ دقائق اور عارفانہ حقائق بھی شامل کر دیے ہیں، نیز اخلاقی رموز و نکات کے ساتھ ساتھ آدابِ حکمرانی کا ذکر بھی اس میں آگیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب دکنی اردو میں ہے اور اس کا مصنف آخری قطب شاہی حکمراں ابوالحسن تاناشاہ کا درباری شاعر طبعی گولکنڈوی ہے جو ایک روایت کے مطابق تاناشاہ کا پیر بھائی بھی تھا یعنی وہ دونوں ایک ہی بزرگ کے مرید تھے۔ طبعی کے زیادہ حالات دستیاب نہیں۔ "تاریخ اردو ادب" جلد اوّل میں جمیل جالبی نے طبعی اور اس کی مثنوی کا ذکر مختصراً ان لفظوں میں کیا ہے:

"(طبعی نے) مذاقِ زمانہ کے مطابق اگرچہ غزلیں بھی لکھیں لیکن اس کا اصل کارنامہ مثنوی "بہرام وگل اندام" ہے..... اس مثنوی میں اس نے اپنے مرشد شاہ راجو اور بادشاہِ وقت ابوالحسن دونوں کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔ "بہرام وگل اندام" 1340 اشعار پر مشتمل ہے۔ 40دن کے عرصے میں 1081ھ / 1670ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔" (ص-508)

مثنوی "بہرام وگل اندام" کے اب تک صرف دو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک نسخے میں اس کا سنِ تصنیف 1081ھ اور ایک میں 1083ھ درج ہے۔ اس کی توجیہ ڈاکٹر نورالسعید اختر نے ان لفظوں میں کی ہے: "راقم کا خیال ہے کہ طبعی نے یہ مثنوی 1081ھ میں مکمل کی اور ابوالحسن تاناشاہ کی تخت نشینی کے بعد 1083ھ / 1672ء میں اس میں مدح کے اشعار کا اضافہ کر دیا۔" یعنی مثنوی تاناشاہ کے پیشرو سلطان عبداللہ قطب شاہ کی زندگی میں کہی گئی جو 1081ھ میں زندہ تھا اور اس میں اس کے جانشین تاناشاہ کے لیے مدحیہ اشعار کا اضافہ اس کے تخت نشیں ہوجانے کے بعد 1803 میں کیا گیا۔ اپنے اس خیال کی تائید میں انھوں نے محی الدین قادری زور، محمد اکبرالدین صدیقی اور جمیل جالبی کا حوالہ دیا ہے۔ دونوں قلمی نسخوں میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ مخطوطہ لندن میں جسے مرتب نے مخطوطہ "الف" کہا ہے شاعر نے اشعار کی تعداد 1340 بتائی ہے اور مخطوطہ حیدر آباد میں جسے مخطوطہ "ب" کا نام دیا گیا ہے طبعی نے مثنوی کو 1330 شعروں پر مشتمل کہا ہے۔ اس فرق کی نشاندہی کے ساتھ فاضل مرتب نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ مخطوطہ لندن صرف 1313 اور مخطوطہ حیدر آباد صرف 1284 اشعار پر مشتمل دستیاب ہوا ہے۔ دونوں مخطوطات کے مقابلے کے بعد اشعار کی تعداد 1337 ہوگئی۔ دو مزید اشعار انھیں رتن پنڈوری کی کتاب "ہندی کے مسلمان شعرا" میں ماخذ کے حوالے کے بغیر دستیاب ہوئے، وہ بھی انھوں نے شامل کر لیے۔ اس طرح ان کا مرتب کردہ یہ نسخہ 1339 شعروں پر مشتمل ہے۔

طبعی نے اپنی مثنوی کی بنیاد امین الدین امین سبزواری کی فارسی مثنوی کو بنایا ہے۔ دونوں مثنویوں کی بحریں اگرچہ مختلف ہیں لیکن اکثر مقامات پر طبعی نے امین کے اشعار کا لفظی ترجمہ کر دیا ہے اور قصے میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے شاید وہ 1340 شعروں پر مشتمل مثنوی صرف چالیس دن میں کہہ گزرا جیسا کہ اس کا اپنا دعویٰ ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ مثنوی شعری محاسن سے عاری ہے، فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں اس کے شعری محاسن اور فنی خوبیوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں فرہنگ کی شمولیت نے کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھادی ہے۔ مثنوی میں جو کہانی بیان ہوئی ہے، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

کشورِ روم کا بادشاہ اولادِ نرینہ نہ ہونے سے دلگیر تھا۔ ایک عرصے بعد اللہ نے اسے اولادِ نرینہ دی۔ نجومیوں کے مشورے سے نومولود کا نام بہرام رکھا گیا جو بعد میں گور کے شکار میں شغف کی وجہ سے بہرام گور کہلایا۔ بہرام نے بچپن ہی میں جملہ علوم وفنون پر دستگاہ حاصل کرلی۔ بہرام کی سعادت مندی سے خوش ہو کر شاہ کشور نے اسے سات نصیحتیں کیں تاکہ وہ نظامِ سلطنت کو بخوبی سنبھال سکے۔ اس نے بہرام کو ایک برق رفتار گھوڑا عنایت

کیا اور اسی کے ساتھ ملک کی باگ ڈور اسے سونپ دی۔ قیصر چین کی بیٹی گل اندام کے حسن و جمال کے قصے سن کر بہرام گور اس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے بادشاہ سے سیر و شکار کے بہانے کچھ دن کی رخصت طلب کی۔ راستے میں اسے خطرناک درندوں اور ہیبت ناک بلاؤں سے واسطہ پڑا جنھیں زیر کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ ایک مرحلے پر وہ اپنے لشکر سے بچھڑ گیا۔ ایک پہاڑ پر اس نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو ایک مورت تراش رہا تھا۔ مورت پر نظر پڑتے ہی بہرام بے ہوش ہو گیا۔ بزرگ کی توجہ سے ہوش میں آیا اور اس کے پوچھنے پر بزرگ نے بتایا کہ یہ گل اندام کا عکس ہے۔ بہرام اس کی طلب میں سرشار تنِ تنہا اپنے وفادار گھوڑے کے ساتھ نکل پڑا۔ ایک جگہ اس نے گھوڑے کو درخت سے باندھا اور تلوار سرہانے رکھ کر آرام کرنے لگا۔ سمن بو پری نے اسے دیکھا تو اپنے دیو پیکر بھائیوں کے خطرے سے آگاہ کیا مگر سامنا ہونے پر بہرام ان پر غالب آیا اور سمن بو کے کہنے پر ان کی جاں بخشی کی۔ وہ اس کے مطیع ہو گئے۔ بہرام اگلے سفر پر روانہ ہوا، دشوار گزار گھاٹیوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے گزرا۔ اسے ایک کشتی ملی جو سامانِ تجارت کے ساتھ چین جا رہی تھی۔ کشتی پر ایک خوفناک مگرمچھ نے حملہ کر دیا، جسے بہرام نے مار دیا۔ کشتی میں بہرام کا گھوڑا بھی سوار تھا۔ کئی ماہ بعد کشتی آخر چین کے ساحل سے جا لگی۔ چین کی سرحد کے پاس بہرام نے ایک لشکر جرار دیکھا۔ یہ بلغار کے بادشاہ بہزاد کا لشکر تھا۔ قیصر چین بہزاد سے اپنی بیٹی گل اندام کی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا انتقاماً بہزاد نے دھاوا بول دیا تھا۔

بہرام نے بال جلا کر ان دیووں کو اپنی مدد کے لیے طلب کیا جن کی وہ خود مدد کر چکا تھا۔ ان کی مدد سے اس نے بہزاد کی فوج پر شب خون مارا اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ بہزاد مارا گیا۔ یہ خبر شاہ چین کو ملی تو اس نے وزیروں سے اس بہادر کے بارے میں جاننا چاہا۔ بہرام نے گل اندام کے محل کا رخ کیا، گل اندام جھروکے میں آئی تو بہرام تاب نہ لا سکا اور ہوش گنوا بیٹھا۔ گل اندام بھی اس کی طرف مائل ہو گئی — قصہ پھر بہت سے نشیب و فراز سے گزرا جن کی تفصیلات طبعی نے بڑی قدرتِ کلام کے ساتھ بیان کی ہیں، بیچ بیچ میں اخلاقی پہلو بھی ابھارتا گیا ہے اور نیکی و بدی کی ازلی آویزش پر حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کشورِ روم بہرام کی گم شدگی سے پریشان تھا۔ آخر اس کے جاسوس بہرام کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ بہرام اور گل اندام کی شادی دھوم دھام سے ہوتی ہے اور اس شادی کے نتیجے میں دو بڑی سلطنتیں ایک دوسرے کی دوست بن جاتی ہیں۔

اردو کی جڑوں کی تلاش اور اس کے تہذیبی کردار سے آشنائی دکنی شعر و ادب کو حوالہ بنائے بغیر ممکن نہیں۔ قومی اردو کونسل نے اپنے اشاعتی پروگرام میں دکنیات کو جو اہمیت دی ہے، اس کے لیے وہ تمام اردو والوں کی طرف سے شکریے کی مستحق ہے۔

●

قواعد کیٹلاگ سازی / مترجم: ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری

صفحات: 784، قیمت: 268 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد سلیم الدین ندوی

کیٹلاگ (Catalogue) گریک لفظ "Katalogus" سے ماخوذ ہے، Kata کا مطلب ہے موافق اور Logus کے معنی ہیں ترتیب۔ کیٹلاگ صرف کتابوں کی فہرست نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب اس مخصوص طریقے سے حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے کہ مقامِ اشاعت، تاریخِ اشاعت اور قیمت وغیرہ کی تفصیلات درج رہتی ہیں۔ لائبریری سائنس میں کیٹلاگ سازی لائبریری میں برائے مطالعہ موجود مواد کو تسلیم شدہ اصولوں کی بنیاد پر ترتیب دیے جانے کا نام ہے، تاکہ پڑھنے والوں کو ان کا مطلوبہ مواد ضرورت پڑنے پر بہ سہولت حاصل ہو سکے۔ مارگریٹ مان کے مطابق "کیٹلاگ سازی کا مقصد کتابوں کے ذخیرے کو اس طرح ترتیب دینا ہے کہ انھیں تلاش کرنے میں سہولت ہو اور انھیں حسبِ ضرورت استعمال کیا جا سکے، لہٰذا اچھی کیٹلاگ سازی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یکسانیت، موزونیت اور سادگی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کیٹلاگ کی تیاری تسلیم شدہ اصول و ضوابط کے مطابق ہو۔"

زیرِ نظر کتاب "قواعد کیٹلاگ سازی" انھی اصول و ضوابط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تیار کی گئی ہے جو امریکی اور برطانوی کتب خانوں کے 35 سالہ مطالعے کا ماحصل ہے۔ کتاب کیٹلاگ سازی کے تمام اصول و ضوابط پر محیط اور جدید تقاضوں کے مطابق ہے۔ اس میں اندراجات کے تمام اصول تفصیل سے بتائے گئے ہیں اور انھیں مثالوں سے واضح بھی کیا گیا ہے جس سے قواعد کے سمجھنے میں پوری مدد ملے گی۔ کتاب میں کتابوں کی فہرست سازی کے علاوہ جریدوں، مائکروفارم، مائکروفلم، مخطوطات، کتاب نما مواد وغیرہ کی ترتیب و تنظیم کے قواعد بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی نقشوں، موشن پکچرز، فلم اسٹرپ، موسیقی، صوتی ریکارڈ اور تصویروں کے ذخیروں کے لیے بھی جامع قواعد دیے گئے ہیں۔ قواعد تین حصوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں اندراج اور سرخی کا ذکر ہے جبکہ دوسرا توضیحات سے متعلق ہے۔ حصہ سوم کو غیر کتابی مواد کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ ہر باب میں قاعدوں کو دو زمروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی "قواعد برائے اندراج" اور

قواعد برائے توضیح"۔ بقول مؤلف "حصہ اوّل اور دوم کے بہت سے ابواب میں قاعدوں کو عمومی اور خصوصی قاعدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عمومی اور خصوصی قاعدوں کا یہ امتیاز تمام قاعدوں میں برقرار رکھا گیا ہے۔"

کتاب کے آخر میں پانچ ضمیمے دیے گئے ہیں، پہلا ضمیمہ کیٹلاگ سازی اور کتابیات کی ان مصطلحات کی تعریفات سے متعلق ہے جو کتاب میں استعمال ہوئی ہیں، جیسے "زائد اندراج"، "زائد سرورق" اور "تجزیاتی اندراج" وغیرہ۔ دوسرا ضمیمہ جلی حروف کے بارے میں ہے کہ ان کا استعمال کن مواقع پر ہوگا۔ تیسرے ضمیمے میں اعداد سے متعلق بتایا گیا ہے کہ کس جگہ عدد کو رومن عدد میں لکھا جائے اور کس جگہ عربی اعداد کا استعمال کیا جائے۔ چوتھے ضمیمے میں اعراب اور علامات کا ذکر ہے جیسے "مربع بریکٹ"، "علامتِ وقف" اور "سیمی کولن" وغیرہ اور پانچویں ضمیمے میں بالاختصار ان ابواب اور صفحات کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں ان قواعدِ اندراج اور سرخیوں کا استعمال ہوا ہے جو برطانوی متن میں مختلف ہیں۔ سب سے آخر میں انگریزی۔ اردو، اور اردو۔ انگریزی فرہنگ مصطلحات کا مترجم نے اضافہ کیا ہے جو اس فن سے متعلق اصطلاحات کی افہام و تفہیم میں کافی معاون ہوں گی۔

انگریزی میں یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اردو داں طبقے کے لیے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے ایما پر ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمے میں سلیس، سادہ اور آسان زبان استعمال کی گئی ہے اور اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے کہ مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے۔ کتاب میں املا کی چند غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ کتاب کا نام "قواعدِ کیٹیلاگ سازی" لکھا گیا ہے جبکہ متن کے اندر کئی جگہ یہ لفظ صحیح املا کے ساتھ "کیٹلاگ" لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ کونسل کی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کو بھی قبولِ عام حاصل ہوگا اور اس کے آئندہ ایڈیشن میں مزید اضافے کے ساتھ املا کی ان معمولی غلطیوں کو بھی دور کر دیا جائے گا جو اس میں کہیں کہیں رہ گئی ہیں۔

•

دلچسپ کہانیاں / ڈاکٹر رام آسرا راز

صفحات: 188، قیمت: 15 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: شبنم آرا

قصہ کہانی سننے سنانے کی روایت انسانی تمدن کے آغاز سے ہی ہر ملک اور ہر سماج میں رہی ہے، زمانۂ قدیم میں دن بھر کا تھکا ہارا انسان دوستوں کے حلقے میں بیٹھتا، اپنے تجربات و مشاہدات سناتا اور دوسرے کے سنتا۔ اس طرح قصے کہانی نے جنم لیا۔ کہانیوں کا سلسلہ مختلف مذہبوں کی مقدس کتابوں کو سنگیت، ناچ، ناٹک وغیرہ سے لے کر تہذیبی زندگی کے ہر نشیب و فراز سے وابستہ ہے۔ دراصل تہذیبی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں سے ہی کہانی جنم لیتی ہے۔ کہانی کے کردار وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ ابتدا میں جن، دیو، پری کو مرکزیت حاصل رہی۔ پھر شہزادوں، شہزادیوں، وزیروں، تاجروں اور درویشوں نے ان کی جگہ لی۔ اب موجودہ دور میں عام انسان ہماری کہانیوں کے کردار ہیں۔

کسی بھی ملک و قوم کی ترقی کا دارومدار اس ملک و قوم کی نئی نسلوں پر ہوتا ہے، خصوصاً بچے قوموں کا مستقبل ہوتے ہیں جو بچے اپنے دل و دماغ کو زمانے کی تازہ ہوا کے لیے کھلا رکھیں گے اور تعصب کے دائرے میں محدود نہ رہ کر انسان دوستی اور ہمدردی کا درس لیں گے، وہی ان تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب ان معصوم بچوں کی ذہنی نشو و نما مناسب ماحول میں ہو۔ بچوں کی ذہنی تفریح اور تربیت کا ایک موثر وسیلہ کہانیاں بھی ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں کل اکیس کہانیاں شامل ہیں۔ یہ سبھی کہانیاں دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ مرتب نے کہانیوں کے انتخاب میں یہ بھی ملحوظ رکھا ہے کہ ان کا مطالعہ بچوں کی معلومات میں اضافے کا سبب بھی بنے۔ وہ جس دنیا میں رہ رہے ہیں، اس کے بارے میں بہتر طور پر جان سکیں۔ اپنے ملک کی تاریخ، اس کے جغرافیہ اور اس کے سماجی ماحول سے انھیں شناسائی حاصل ہو سکے۔ ہر کہانی سماج کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ بچوں کی ذہنی استعداد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہانیوں کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے اور زبان بہت سادہ استعمال کی گئی ہے۔ کتاب کا سرورق پرکشش اور دیدہ زیب ہے جو بچوں کو اپنی جانب متوجہ کرے گا۔

•

اٹل بہاری واجپئی۔ شخصیت اور خدمات / آباد جعفری

صفحات: 104، قیمت: 250 روپے

ناشر: اتراکھنڈ اردو جرنلسٹس اینڈ رائٹرس کمیٹی، چارلٹن لاج کمپاؤنڈ، ملی تال، نینی تال

مبصر: ملک راشد فیصل

مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کی سوانح عمریاں، نئی نسلوں کے لیے فکر و عمل کی راہیں کھولتی ہیں، سیاست کا میدان عام طور پر خار دار جھاڑیوں سے بھرا ہوتا ہے جس سے گزر کر اپنی منزل کو پالینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے موضوع اٹل بہاری واجپئی نے موجودہ سیاست میں تمام مشکلات کو سر کر کے بلندیوں کو چھولیا

ہے۔ وہ ایک ایسے قومی لیڈر ہیں جو اپنے کردار و گفتار سے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر قومی سیاست کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کا ہر جملہ خبر بن جاتا ہے۔ ان کی تقریریں ایک مخصوص انداز لیے ہوتی ہیں۔ 1996 اور 1998 کے درمیان تین حکومتوں کے سقوط کے بعد ملک کے موجودہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے پانچ سال پورے کر لیے ہیں۔ 24 مختلف الخیال حلیف سیاسی جماعتوں پر مشتمل حکومت کو پائداری کی شکل دینا ان کی سیاسی مہارت پر دال ہے۔ 2020 تک بھارت کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا کر دینے کا خواب دیکھنے والے اٹل بہاری واجپئی ایک معتدل مزاج اور بااثر سیاسی لیڈر خیال کیے جاتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب محض 104 صفحات پر مشتمل ہے جسے آباد جعفری نے آج کے معروف قاری اور خود اٹل بہاری واجپئی کی رائے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مصنف کے مطابق انھوں نے کتاب ضخیم تیار کی تھی مگر وزیر اعظم سے تبادلہ خیال کے بعد اور ان کی خواہش کے مطابق کتاب کی ترتیب انھیں از سر نو کرنی پڑی۔ اس عمل میں یہ کتاب اتنی مختصر ہو گئی ہے کہ اٹل جی کی مکمل شخصیت و خدمات کا احاطہ نہیں ہو سکا ہے۔ پھر بھی موضوع کے انتہائی اہم گوشوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف سید آباد جعفری کا تعلق اترانچل کے ضلعے نینی تال سے ہے۔ وہ ایک صحافی اور معلم ہیں اور انھوں نے حکومتی شعبوں سے وابستہ رہ کر سماجی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ وہ اقلیتی کمیشن (نینی تال) کے ضلع انچارج اور اردو اکادمی یوپی کے ممبر رہے ہیں۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے "ایک نیا راہ گیر" رسالے کی خدمت انجام دی ہے۔ ان کی دو کتابیں "وجیِ اوّل" اور "سیرتِ ارشاد" اردو میں منظر عام پر آچکی ہیں اور اردو اور ہندی میں مزید کتابیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے موضوع سے ان کا گہرا تعلق رہا ہے اور اسی لیے انھوں نے سیدھے سادے اور رواں الفاظ میں موضوع کی بھرپور عکاسی کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ تاہم کتاب میں کچھ ایسی باتیں بھی در آئی ہیں جو سوانح عمری کے اصولوں کے خلاف قرار دی جا سکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مصنف نے کتاب کے شروع کے محض 42 صفحات حالاتِ زندگی پر صرف کیے ہیں اور ان میں بھی کچھ صفحے انتساب، پیغام اور گزارش کی نذر ہو گئے ہیں۔ بقیہ صفحات میں انھوں نے واجپئی جی کی اہم تقاریر کے اقتباسات اور اہم نظموں کو پیش کر کے خود کو بری الذمہ کر لیا ہے جب کہ سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ غیر جانب دار ہو کر ممدوح کے حالات و خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کرے تاکہ قارئین کے سامنے مثبت و منفی دونوں رخ مکمل کر آجائیں۔ مصنف نے اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ شخصیت کے مختلف گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ بہر حال اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ بڑے سیاست دانوں کے حالات و خیالات جاننے میں قارئین اس لیے دل چسپی لیتے ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں ان سے یا ان کے خیالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اٹل بہاری واجپئی مہذب اور معتدل مزاج انسان ہیں۔ ان کی شاعری سے ان کی انسان دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔ مصنف نے اٹل جی کی تقریروں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا ہے اور ان کی ملکی اور غیر ملکی پالیسیوں کے اہم گوشوں سے روشناس کرانے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اٹل جی کی بعض اہم نظمیں بھی قارئین کو متاثر کریں گی۔

•

موتی اُگے دھان کے کھیت / بکل اُتساہی

صفحات:208، قیمت:-/125 روپے

ناشر: ڈاکٹر صوفیہ بلقیس

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: ایس اے رحمٰن

بکل اُتساہی مشاعروں کے مقبول شاعروں میں سے ہیں اور ایک زمانے میں ان کے گیت ان کی پہچان بنے ہوئے تھے۔ لیکن شاعری مشاعروں سے ہٹ کر بھی ہوتی ہے اور وہی شاعر نکھر تا ہے جو صفحۂ قرطاس پر اپنی شناخت بنا سکے۔ بکل اُتساہی نے برسوں اس طرف توجہ نہیں دی لیکن بقول سید محمد اشرف "مقبول شاعری اور معروف شاعری جیسی اصطلاحات سے بے نیاز، ترقی پسندی اور جدیدیت کے گورکھ دھندوں سے دور، لوک روایت کے امین، غنائیت کے وصف سے مالا مال، اپنے ہی لہو کی آگ میں کندن ہو جانے والے بکل ہماری شاعری کا ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔" اردو کی ادبی دنیا میں ان کی صحیح پہچان نہیں بن سکی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کی غزلوں کا پانچواں مجموعہ ہے جس کا نام توجہ طلب ہے۔ دھان سے جب چاول نکلتا ہے تو وہ چمکدار موتی کی ہی طرح ہوتا ہے۔ اس معنویت سے بھرپور عنوان کے تحت بکل اُتساہی نے اپنی ایک سو اتسی غزلیں یکجا کر دی ہیں (دو حمد اور ایک نعت ان غزلوں سے پہلے شاملِ کتاب ہیں)۔ ان غزلوں کا مطالعہ بکل اُتساہی کے اس شعر کی روشنی میں کیا جائے تو شاعر کے کلام سے بہتر انداز میں محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔

غزل کے شہر میں گیتوں کے گاؤں بسنے لگے
مرے سفر کے ہیں یہ راستے نکالے ہوئے

ویسے بھی گیت بکل اُتساہی کی پہلی پسند ہے۔ غزلوں میں بھی وہ گیتوں کے حوالے بار بار دیتے ہیں۔

پہلے میرے گیت وہ سُن سُن کے شرماتے رہے
پھر انھیں گیتوں کو تنہائی میں دہراتے رہے

گیت نما غزل کا انداز دیکھیے:

برکھا بارہ ماسی
پھر بھی دھرتی پیاسی
تازہ تازہ چہرے
رنگت باسی باسی
لفظ لفظ بنجارے
گیت گیت سنیاسی
بکل جھوٹ کا عادی
سچ بولے تو عاصی

مختصر الفاظ میں بھی شاعر کو بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ مجموعے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بکل کے اشعار میں خوابوں کے دھندلکے بھی ہیں اور حقائق کی تلخیاں بھی۔ کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے جس کے سرورق کے دھان کے کھیت نظروں کو بھلے لگتے ہیں۔ بکل اُتساہی کے مداحوں کے ساتھ ساتھ اردو غزل کے عام قارئین کے لیے بھی یہ مجموعہ قابلِ پذیرائی ہے۔

•

تعاقب / خورشید جبیں چاندنی

صفحات:176- ، قیمت:-/200 روپے

ناشر: یونیورسل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

یہ ایک نومشق ادیبہ خورشید جبیں چاندنی کے افسانے اور انشائیے ہیں جو اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں طب پڑھ رہی ہیں۔ ادب کا ذوق اچھی چیز ہے مگر جبیں صاحبہ نے اپنی تحریروں کو کتابی شکل دینے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ دیگر فنی امور سے قطع نظر سبھی افسانوں اور انشائیوں میں زبان و بیان کی ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں جو تھوڑی سی توجہ سے دور کی جاسکتی تھیں۔

•

پیش رفت / پریمی رومانی

صفحات:200- ، قیمت:-/200 روپے

ناشر: رچنا کار پبلی کیشنز، 'تپسیا' 1/3، نصیب نگر، پیپوش کالونی، جانی پور، جموں

ڈاکٹر پریمی رومانی اردو کے مشہور ناقد اور شاعر ہیں۔ وہ کشمیری ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ اردو میں اب تک ان کی آٹھ اور کشمیری میں دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اردو کتابوں میں ایک شعری مجموعہ ہے باقی نثری ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دلچسپی نثر میں زیادہ ہے۔ "پیش رفت" بھی ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اور اقبال، ٹیگور، جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد اور ہرچرن چاولہ کو چھوڑ کر انھوں نے زیادہ تر ان ادیبوں اور شاعروں پر قلم اٹھایا ہے جن کا تعلق سرزمینِ کشمیر سے ہے اور جن پر اب تک ہماری تنقید نے وہ توجہ نہیں کی، جس کے وہ مستحق ہیں۔ پریمی صاحب نے ان کی عملی زندگیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کی ادبی کارگزاریوں کا بھی بھرپور تعارف کرایا ہے۔ کتاب کا ایک اہم مضمون "اردو کے تئیں ریاست کے ادبی اداروں کا رول" ہے جس میں بیسویں صدی کے اوائل سے موجودہ صدی تک کی ان ادبی انجمنوں اور ان کے کاموں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس طویل مدت میں علمی، ادبی محاذ پر سرگرم رہیں اور جنھیں برصغیر کے مشاہیر اہلِ قلم کی میزبانی کے مواقع بھی ملے۔

"اردو دنیا" اور "فکر و تحقیق" کے سالانہ خریدار بنیں

"اردو دنیا" اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے---خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں۔ سالانہ قیمت:100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **"فکر و تحقیق"** کا مطالعہ کریں۔ سالانہ قیمت: 100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں: (دہلی سے باہر کے لوگ -/110 روپے کا چیک بھیجیں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: جے رادھاکرشنن
ترجمہ: غلام حیدر

بچوں کا گوشہ

سرواپلی رادھاکرشنن

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہمارے رہنما" (جلد -3) سے اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

"ہمارے رہنما" (جلد-3) میں راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین، سریندر ناتھ بنرجی، وی۔او۔چدامبرم پلائی، سری نواسارامانجن، سرواپلی رادھاکرشنن، راج کماری امرت کور اور جے پرکاش نرائن کے سوانحی خاکے پیش کیے گئے ہیں جنھیں بالترتیب سوپنا دتا، رنجیتا گوہا، کمل۔آر۔مترا، اندرا آننتھا کرشنن، کے۔ایس۔سری نواسن، رادھا کرشنن، ساوتری ماکھی جانی اور نیلما سنہا نے تحریر کیا ہے۔

192 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 35.00 روپیے ہے۔

ہندستان کو قدرت نے استادوں یا گروؤں کا ایک لمبا سلسلہ عطا کیا ہے جو علم کی مختلف شاخوں میں صدیوں سے آج تک قائم ہے۔ ان کے سبق یا علم کی تقسیم صرف کلاس کے کمروں تک ہی محدود نہیں رہی ہے، یہ ساری دنیا میں پھیلتی رہی ہے۔ اسی زنجیر کی ایک کڑی کی حیثیت سے سرواپلی رادھا کرشنن فلسفے میں ایک غیر معمولی ممتاز حیثیت رکھنے والے استاد نظر آتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پہلے ہندستانی ہیں جنھوں نے دماغوں کو روشن کرنے والے لیکچر اور اپنی علمی کتابوں کے ذریعے ہندستانی فلسفے کو مغرب کے سامنے پیش کیا۔

رادھا کرشنن 5/ستمبر 1888 کو تیروتانی کے مقام پر ایک غریب برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سرواپلی ویراسوامی اور ماں کا نام سیتلما تھا۔ سرواپلی آندھراپردیش کا ایک گاؤں ہے جہاں سے رادھاکرشنن کے بزرگ ہجرت کرکے تامل ناڈو میں آباد ہوگئے تھے۔ ویراسوامی ایک زمینداری میں بہت معمولی سے ملازم تھے۔ ظاہر ہے کہ پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی والے اتنے بڑے خاندان کو پالنے پوسنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔

وظیفوں کی مدد سے رادھاکرشنن اپنی تعلیم چلاتے رہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم تیروتانی میں اور اعلا تعلیم تروپتی کے لوتھیرن مشن اسکول میں ہوئی۔ یہ دونوں جگہیں جنوبی ہندستان کی مشہور مذہبی زیارت گاہیں (تیرتھ استھان) ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مدراس سے 60 کلومیٹر دور ویلور کے وورھی کالج میں پڑھا۔

تروپتی، ویلور اور مدراس کے مشنری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے رادھاکرشنن کو انجیل پر پورا عبور حاصل ہوگیا اور عیسائی مذہب کو انھوں نے کسی قدر پسند بھی کرنا شروع کردیا لیکن ان مشنری اسکولوں میں ہندو عقیدوں اور طور طریقوں پر جو نکتہ چینی کی جاتی تھی، انھیں اس سے تکلیف بھی ہوتی تھی۔

حالانکہ رادھاکرشنن کی بہت خواہش تھی اور ان کے بہت سے پروفیسروں کا بھی خیال تھا مگر رادھاکرشنن اپنی تعلیم کو آگے جاری رکھنے

کے لیے آکسفورڈ نہ جاسکے۔ اب انھیں اپنے خاندان کی معمولی سی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کمانا ضروری تھا اور پھر اس پرانے رواج کے مطابق جسے ان کا خاندان بڑی سختی سے مانتا تھا، ان کی شادی سوا کا موا ماسے اسی وقت کی جاچکی تھی جب وہ ویلور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس وقت وہ خود صرف 16 سال کے اور ان کی بیوی 10 سال کی تھیں۔

چنانچہ امتیازی درجے پر ایم۔اے۔ کی ڈگری حاصل کرتے ہی رادھا کرشنن نے 1909 میں مدراس پریسیڈنسی کالج میں اسسٹنٹ لکچرر کی حیثیت سے پڑھانا شروع کر دیا، اور یہی ان کے پیشے کی ابتدائی منزل تھی۔ یہ مدراس سب آرڈینیٹ سروس میں سب سے کم گریڈ کی جگہ تھی۔ اس زمانے میں لکچرر کو 100 روپے تنخواہ ملتی تھی۔

انھوں نے اپنی ترقی کے مواقع کو بہتر کرنے اور ہندستانی کلاسیکی فلسفے پر عبور حاصل کرنے کے لیے 'اپنشدوں'، 'بھگوت گیتا'، بدھ مت کی بنیادی تحریروں، چینی فلسفوں اور ان کے ساتھ ساتھ 'برہم سوترا'، 'شنکر، رامانجا اور مادھو کی تفسیری اور وضاحتی تحریروں کا مطالعہ کیا۔ پھر ان کے ساتھ ہی ساتھ وہ مغربی فلسفے پر بھی خصوصی استعداد پیدا کرتے چلے گئے۔ انھوں نے افلاطون، پلوٹینیوس، کانٹ، براڈلے اور برگساں کے فلسفوں پر خاص مہارت حاصل کرلی۔ یہی وہ مغربی فلسفی تھے جنھوں نے رادھا کرشنن کے ذہن پر سب سے گہرا اثر ڈالا تھا۔ انھیں انگریزی ادب بھی بہت پسند تھا چنانچہ ان کی کتابوں میں جگہ جگہ شیکسپیر، ورڈس ورتھ، میتھیو آرنلڈ، والٹ وھٹ مین، کالرج اور براؤننگ کے اقتباس نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے یورپی کلاسیکی استادوں، دانتے، گوئٹے وغیرہ کی تحریروں کا بھی کافی حوالہ دیا ہے۔

ان کا ذہن تازہ سے تازہ فلسفیانہ تصورات کی تلاش میں رہتا تھا، چنانچہ انھوں نے مارکسزم، وجودیت اور عمر کے آخری حصے میں اپنے دور کی شاعری اور آرٹ میں ابھرنے والے رجحانوں کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا۔

رفتہ رفتہ یہ پتلا دبلا سا جسم، بڑا سا سر، چشمہ لگائے، کھلی روشن پیشانی، پتلی عقابی ناک، ایک لمبا پیلا سا کوٹ، سفید پگڑی اور بے داغ سفید دھوتی میں ملبوس یہ شخص علمی دنیا کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت بنتا چلا گیا۔

مدراس کے پریسیڈنسی کالج کے ایک پرانے طالب علم نے انھیں ان الفاظ میں یاد کیا، "وہ اپنی کلاس میں کبھی کبھی دس منٹ دیر سے آتے تھے اور اپنا لیکچر مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ختم کر دیتے تھے لیکن جتنی دیر وہ پڑھاتے تھے ان کا لیکچر موضوع کی وضاحت، اختصار اور صفائی میں بے مثال ہوتا تھا اور اسی لیے جو کچھ وہ پڑھاتے تھے یہ ناممکن تھا کہ کسی طالب علم کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس نوجوان استاد کو ان کے طالب علم اتنا چاہتے تھے جتنا وہ کسی اور کو نہیں پسند کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی کلاس میں ایک لفظ سخت نہیں کہا مگر ان کی کلاس کا ڈسپلن سب سے سخت تھا۔"

مگر اس مقبولیت کے باوجود رادھا کرشنن کو اپنی دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ ایک بہت لمبے چوڑے ملے جلے خاندان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انھیں متواتر روپے پیسے کی ضرورت رہتی تھی۔ والد کے رٹائر ہونے کے بعد انھیں اپنے ذاتی گھر کے علاوہ اپنے بہن بھائیوں کی بھی مدد کرنی ہوتی تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے وہ سب سونے کے تمغے بیچ ڈالے جو انھیں کئی امتحانوں میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنے پر ملے تھے پھر اپنے ایک خیر خواہ کے مشورے پر انھوں نے اپنے نفسیات پر دیے ہوئے تمام لیکچروں کو جمع کیا اور انھیں 'نفسیات کے ابتدائی نکتے' (The Essentials of Psychology) کے عنوان سے ایک کتاب کی شکل میں چھپوا دیا۔ یہ کتاب طالب علموں میں بہت پسند کی گئی مگر ایک اہم قرض کو فوری طور پر ادا کرنے کے دباؤ سے مجبور ہو کر انھیں اس کتاب کی اشاعت کے حقوق (کاپی رائٹ) ہمیشہ ہمیشہ کے لیے 500 میں بیچنے پڑے۔

ایک یکتا اور ممتاز استاد کی حیثیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ رادھا کرشنن نے اپنی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ بین الاقوامی شہرت والے رسالوں میں اپنے پر مغز اور ذہنوں پر گہرا اثر چھوڑنے والے مضامین چھپوا کر بھی کیا۔

1918 میں میسور یونی ورسٹی نے رادھا کرشنن کو اپنے یہاں فلسفے کا پروفیسر چن لیا۔ ظاہر ہے یہ ان کی استادی یا پڑھانے کی قابلیت اور عالمانہ شہرت اور مقبولیت کا اعتراف تھا اور اسی عالمانہ شہرت نے انھیں ایک ہونہار اور ایسے لکھنے والے کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا جس سے مستقبل میں بہت سی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

رادھا کرشنن کی پہلی باقاعدہ کتاب 'رابندر ناتھ ٹیگور کا فلسفہ' (The Philosophy of Rabindra Nath Tagore) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ٹیگور پر لکھی گئی کتاب کی کامیابی کے دو سال بعد 1920 میں رادھا کرشنن کی دوسری کتاب، 'موجودہ فلسفے پر مذہب کی چھاپ' (The Reign of Religion on Contemporary Philosophy) منظر عام پر آئی۔

ان دو کتابوں اور بین الاقوامی شہرت والے رسالوں میں رادھا کرشنن کے مضامین کی اشاعت نے انھیں کلکتہ یونی ورسٹی کے روشن دماغ وائس چانسلر آشو توش مکھرجی کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ وہ غیر معمولی ذہین (جینیئس) لوگوں کو بھانپنے اور دریافت کرنے کی صلاحیت کے لیے مشہور تھے۔ انھوں

نے 33 سالہ جوان عالم رادھا کرشنن کو کلکتہ یونی ورسٹی میں 'جارج پنجم پروفیسر آف فلاسفی' کی قابلِ قدر جگہ پر رکھ لینے میں ذرا جھجک محسوس نہیں کی اور یہ 1921 میں وہاں پروفیسر ہو گئے۔

رادھا کرشنن کا میسور کو چھوڑ کر جانا بھی خاصا دل دوز منظر تھا، حالانکہ انھوں نے وہاں صرف تین سال 1918 سے 1921 تک کام کیا تھا۔ لیکن وہاں کے طالب علموں سے ان کے خصوصی رشتے اور تعلق کی وجہ سے یہ وہاں بہت ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک اور غیر معمولی صلاحیت کا بھی وہاں حیرتناک طور پر اظہار کیا تھا۔ یہ اپنے ایک ایک طالب علم کو پہچاننے اور یاد رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا انھوں نے ایک الگ نام بھی رکھ لیا تھا اور پھر بعد میں جب کوئی طالب علم برسوں بعد بھی ان سے کہیں ملتا تو یہ اس کا وہی نام لے کر مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے۔

ان کے اسی پیار اور قربت کا سچے دل سے اعتراف کرتے ہوئے میسور کے طالب علموں نے ان کو کچھ اس انداز میں رخصت کیا کہ ایسا الوداعی فنکشن اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ طالب علموں نے ضد کر کے رادھا کرشنن کو ایک گاڑی میں بٹھایا اور اسے خود کھینچتے ہوئے اسٹیشن تک لے گئے، "ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جدائی بڑی غم ناک تھی۔" ایک طالب علم نے لکھا تھا۔ رادھا کرشنن کا الوداعی مشورہ بھی طالب علموں کو انوکھا ہی تھا، "آسمانوں پر جھاڑو دیتے وقت زمین سے اپنا پیر کبھی نہ اکھڑنے دینا۔"

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے 1923 میں کلکتے میں اپنی آمد کا ڈنکا اپنی شاہ کار کتاب 'ہندستانی فلسفہ' (Indian Philosophy) چھپوا کر بجایا۔ یہ رادھا کرشنن کی کتاب کا ہی فیض تھا کہ فلسفے کے مطالعے میں ہندستانی فلسفہ ایک اہم اور خصوصی شاخ کے طور پر گنا جانے لگا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (چودھواں ایڈیشن) کے ایڈیٹر کو بھی کچھ جگہ نکالنی پڑی اور اس نے رادھا کرشنن سے ہندستانی فلسفے پر ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔

اس کے بعد رادھا کرشنن کو انگلینڈ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی کے تحت مخصوص 'اپٹون لیکچرز' (Upton Lectures) دینے کے لیے بلایا گیا۔ لیکچرز کا موضوع تھا 'ہندو نظریۂ حیات'۔ بعد میں یہ لیکچر کتاب کی شکل میں منظرِ عام پر آئے۔ 'اپٹون لیکچرز' کے بعد رادھا کرشنن کو آکسفورڈ میں 'مذہبوں کے تقابلی مطالعے کے شعبے' (Department of Comparative Religions) کے صدر کی جگہ کے لیے بلایا گیا۔ اس کے کچھ دن بعد ایک بہت مالدار، انسان دوست شخص مسٹر اسپالڈنگ نے ان کے لیکچرز سے متاثر ہو کر خاص ان کے لیے ایک پروفیسر کی جگہ قائم کر دی۔ اب انھیں آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب اور اخلاقیات پڑھانا تھا۔ اسی دوران انھیں آکسفورڈ یونی ورسٹی کے 'آل سولس کالج' کا فیلو بنا کر اعزاز دیا گیا۔

پروفیسر رادھا کرشنن کا تعلق آکسفورڈ یونی ورسٹی سے 1928 میں قائم ہوا تھا جو بیس سال کی طویل مدت تک برقرار رہا۔ وہ وہاں جنوری سے جون تک چھ مہینے ہندستانی اور عالمی فلسفہ پڑھاتے تھے۔

اپنے لیکچروں کی وجہ سے بے حد مصروفیت اور لکھنے پڑھنے کے کام کے ساتھ رادھا کرشنن کو 1931 میں ایک اور اہم ذمے داری بھی نبھانی پڑی۔ انھیں آندھرا یونی ورسٹی کا وائس چانسلر چنا گیا۔ اس نئی ذمے داری میں انھوں نے اپنی صلاحیت اور دماغی رجحان، تنظیم اور انتظامیہ امور کا زبردست مظاہرہ کیا۔ اپنی مسحور کن شخصیت کی مدد سے رادھا کرشنن آندھرا یونیورسٹی کے معاملات میں سرکاری اقتدار کی مداخلت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی پارٹیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات، دونوں سے یونی ورسٹی کیمپس کو بچائے رکھنے میں کامیاب رہے۔

اپنے علمی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر رادھا کرشنن اس کے لیے بھی کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتے تھے کہ برطانوی سامراج کے نوآبادیاتی راج کے خلاف ہندستان کی مانگوں کو بہترین اور مؤثر انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ اور پھر جب 1947 میں ہندستان آزاد ہو گیا تو یہ بات قدرتی تھی کہ آزاد ہندستان کی پالیسیوں کی تشکیل میں وہ اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کو کام میں لا کر اس عظیم کام میں بھی شامل ہوں۔ اس سلسلے کا پہلا اہم کام انھیں 1948 میں سونپا گیا۔ وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے ان سے درخواست کی کہ وہ 'یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن' کے صدر ہو جائیں۔ اس کمیشن میں ہندستان اور بین الاقوامی سطح کے تعلیم کے ماہرین شامل تھے اور انھیں تعلیم کے نظام کا ایک ایسا خاکہ تیار کرنا تھا جو اسے عرصے پہلے تیار کیے ہوئے میکالے کے نوآبادیاتی طرزِ فکر اور تصورات سے آزاد کر سکے۔

1949 میں رادھا کرشنن کو سوویت یونین کی پہلی سفارت کے لیے چنا گیا۔ یہ چناؤ خود وزیرِ اعظم کے کاموں میں ایسا استثنائی اقدام ثابت ہوا جس کے لیے فہم و فراست یا سمجھ بوجھ سے زیادہ فطرت یا اندرونی تحریک کام کرتی ہے۔ ان کو اس کام کے لیے منتخب کرنا کچھ ایسا تعجب خیز کام تھا کہ ہندستان کے بہت سے سیاسی لوگوں اور ساری دنیا کے سفارتی حلقے کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا حقیقت میں نہرو کا یہ فیصلہ سمجھ داری اور سوجھ بوجھ کا قدم ہے؟ ایک تصوراتی فلسفے کا مفسر کیونزم اور مکمل مادہ پرست ملک میں کیسے کارگر ثابت ہوگا؟ جوزف اسٹالن جیسے شخص پر ایک فلسفی کیا اثر چھوڑے گا؟ لیکن یہ دیکھ کر ہر شخص حیران رہ گیا کہ اس خوش مزاج اور طلسمِ فلسفی کا خاموش جادو اسٹالن پر چل گیا اور 1952 میں رادھا کرشنن کے ماسکو چھوڑنے کے وقت

تک وہ سوویت یونین اور ہندستان کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کر چکے تھے جس میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور حالات کو سمجھنے کا عنصر شامل تھا اور جو چار دہائیوں سے زیادہ عرصے تک برقرار رہا اور سال بہ سال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ سفارتی دنیا کے ایک جانے مانے بزرگ کے مطابق، "آج ماسکو میں ہندستان کو جس نام (کردار) سے پہچانا جاتا ہے، وہ رادھاکرشنن کا ہی دیا ہوا ہے۔"

پھر 5/اپریل 1952 کو ہندستان کا نائب صدر چنے جانے کے بعد ڈاکٹر رادھاکرشنن کے روس سے رخصت ہوتے وقت وزیر خارجہ وائی شینسکی نے ایک لنچ کی دعوت دی۔ دعوت ابھی چل ہی رہی تھی کہ وائی شنسکی نے کہا، "باس آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" اگلی صبح بہت سویرے سفر شروع کرنے سے پہلے رادھاکرشنن کے پاس چند گھنٹے کا وقت تھا۔ چنانچہ رات کو ایک ملاقات طے ہوئی۔

رادھاکرشنن نے بعد میں لکھا، "اسٹالن کا چہرہ کچھ پھولا پھولا سا لگ رہا تھا۔ میں نے ان کی کمر اور کلوں کو تھپتھپایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔"

"آپ پہلے شخص ہیں۔" اسٹالن نے کہا، "جو میرے ساتھ ایک انسان کا سا برتاؤ کر رہے ہیں اور کوئی بھوت یا عفریت نہیں سمجھ رہے۔ آپ ہمیں چھوڑ رہے ہیں، میں اداس ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ لمبے عرصے جئیں، مگر میں اب زیادہ دن نہیں جیوں گا۔" اسٹالن کا چھ مہینے بعد انتقال ہو گیا۔

نائب صدر کی حیثیت سے دو مدتیں پوری کرنے کے بعد سرواپلی رادھاکرشنن 1962 میں ہندستان کے دوسرے صدر چن لیے گئے۔

1954 میں سب سے پہلے رادھاکرشنن کو آزاد ہندستان کا سب سے بڑا اعزاز 'بھارت رتن' عطا کیا گیا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی امریکہ میں 883 صفحات کی 'فلاسفی آف سرواپلی رادھاکرشنن' کے عنوان سے ایک جلد چھاپ کر ان کو اعزاز دیا گیا۔

1956 کا سال رادھاکرشنن کی زندگی میں تنہائی اور اداسی لایا۔ ان کی عزیز اور خدمت گزار بیوی سوا کا سوالما کا انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی شادی شدہ زندگی کے پچاس خوشگوار سال ختم ہو گئے۔ جب رادھاکرشنن کی شادی ہوئی تھی تو وہ مشکل سے دس سال کی تھیں۔ اس جوڑے کے پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا ڈاکٹر ایس۔ گوپال تھے۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن نے اپنی طویل خوشگوار شادی شدہ زندگی کے بارے میں کہا تھا، "مجھے کبھی کبھی فلسفی ہیگل کا قول یاد آتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کا حساب اسی صورت میں پورا کرتا ہے جب وہ زندگی بھر وہی کام کرے جو اس کے مناسب ہو اور اسے ایسی بیوی ملے جس سے وہ محبت کرتا ہو۔"

اپنی شہرت کے اس زینے پر چڑھتے ہوئے جسے انھوں نے خود ہی اپنی محنت اور ذہانت سے تعمیر کیا تھا، مدراس سے میسور، پھر وہاں سے کلکتہ اور آکسفورڈ اور آندھرا اور بنارس یونی ورسٹیوں کی وائس چانسلر شپ سے بڑھتے ہوئے ڈاکٹر رادھاکرشنن اپنے کام اور امتیاز کے سب سے بلند مقام تک پہنچ گئے لیکن اس کی ہرمنزل پر انھیں درخواست کر کے بلایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ کسی طرح کی طرفداری یا نظر کرم نہیں کی گئی تھی اور انھوں نے اپنے امتیازی اور یکتا انداز سے ہر اس جگہ کو زینت بخشی جہاں وہ پہنچے۔ خود وہ آزادی سے پہلے کا ہندستان ہو یا آزاد ہندستان، ہر مقام پر انھوں نے ایسا اعلا معیار قائم کر دیا کہ ان عہدوں پر بعد میں آنے والوں کو اس معیار پر پورا اترنا خاصا مشکل محسوس ہوا۔

1967 میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہوتے ہوئے رادھاکرشنن نے ایک سیدھا سچا مشورہ دیا اور یہ ملک کے لوگوں کے لیے بڑا بروقت اور مفید مشورہ تھا۔ انھوں نے تنبیہ کی۔ "اس سوچ کو بالکل بڑھاوا نہیں دیا جانا چاہیے کہ کوئی تبدیلی زور زبردستی اور پرتشدد ہنگاموں کے بغیر لائی ہی نہیں جاسکتی۔ جب ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں بدعنوانی اور بے ایمانی گھر کر رہی ہو تو عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کچھ مناسب تبدیلیاں پیدا کرلیں۔ ہمیں پرامن تبدیلیوں کا معمار اور انقلاب لانے والی اصلاحات کا وکیل ہونا چاہیے۔ ہمیں وقت کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھنا چاہیے۔"

مئی 1967 میں مدراس واپسی پر ان کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال ہوا چونکہ ان کے ان گنت مداح، ان سے محبت کرنے والے پرانے طالب علم، دوست اور اعزا سب خوش تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے باقی آٹھ سال اپنے گھر 'گرجا' کے اس خوشگوار ماحول میں گزارے، جس کے وہ عادی تھے۔

اس روحانی مسرت یا آنند کے ماحول میں ہندستان کا یہ یکتا فلسفی، جس کی بہت سی کامیابیوں کا نقطہ عروج ہندستان جیسے ملک کی صدارت کا اعزاز تھا، 17/اپریل 1975 کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور لاکھوں ہندستانیوں اور بہت سے غیر ملکیوں کو غمگین اور اداس چھوڑ گیا جو یورپ، امریکہ، ایشیا اور افریقہ میں اس کی فہم و فراست اور عقل کے معتقد تھے۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے افکار و نظریات ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ انھوں نے کہا تھا: "تم فلسفی ضرور ہو جاؤ لیکن اپنی شہرت کی اٹھان کے ساتھ ساتھ آدمی ضرور رہو۔"

◆◆◆

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

[illegible]

مصنف: جگن ناتھ موہنتی / مترجم: سید آصف اختر نقوی

سمندر ہمیشہ سے انسان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کتاب میں سمندر کے بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ مختلف سمندری جانوروں سے بھی واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 52، قیمت: -/23 روپے

[illegible]

مصنف: نوکا رائے / مترجم: تسکین زیدی

اس کتاب میں عام فہم اور دل کش انداز میں برقی گھڑی کی ایجاد سے لے کر مختلف زمانوں میں اس میں آنے والی تبدیلیوں اور اس کی تکنیک سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 32، قیمت: -/12 روپے

[illegible] ہندوستانی چڑیاں

مصنف: این این مجمدار / مترجم: آصف نقوی

رنگ برنگی چڑیاں ہماری دنیا کی خوبصورتی میں اضافہ بھی کرتی ہیں اور انسانی زندگی کے لیے مفید بھی ہیں۔ اس کتاب میں کچھ ہندوستانی چڑیوں سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں اور چڑیوں کی رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

صفحات: 56، قیمت: -/32 روپے

[illegible]

مصنف: راجندر کمار راجیو / مترجم: ایس۔ اے۔ رضوی

بچوں کے لیے بے حد دلچسپ اور معلوماتی کتاب۔ جس میں جانوروں اور پرندوں سے متعلق چند حیرت انگیز حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ [illegible] مختلف مچھلیوں کی بولیاں وغیرہ۔

صفحات: [illegible]، قیمت: [illegible]

صفر کی کہانی

مصنف: دلیپ م۔ سالوی / مترجم: پروفیسر طلعت عزیز

ہمارے ملک ہندوستان کو صفر کی دریافت کا شرف حاصل ہے۔ عربوں نے ہندوستان سے صفر کا استعمال سیکھا اور پھر آہستہ آہستہ پوری دنیا میں یہ عام ہو گیا۔ زیر نظر کتاب میں صفر سے متعلق کئی دلچسپ پہلوؤں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات: 24، قیمت: -/12 روپے

[illegible]

مترجم: پروفیسر طلعت عزیز

اس کتاب میں ذرات، آتش فشاں، مرکز، کشش ثقل [illegible] لیزر [illegible] وغیرہ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 140، قیمت: -/65 روپے

ٹیلی ویژن اور اس کی تکنیک

مصنف: نوکا رائے / مترجم: عارف نقوی

ٹیلی ویژن آج ہماری روز مرہ زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ کتاب ٹیلی ویژن کی ایجاد اور اس سے متعلق [illegible] واقف کراتی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: -/12 روپے

ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے

مصنف: نوکا رائے / مترجم: [illegible] اسلام

ٹیلی فون کی ایجاد اس کی تکنیک [illegible] ٹیلی فون کی [illegible] معلومات اس کتاب میں دی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: -/12 روپے

[illegible]

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

RNI No. 70323/99 DL-15052 / 2003-5

URDU DUNIYA Monthly, September 2003, Vol. 5, Issue: 9

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل نے **پریم چند** کی تمام تحریروں کی اشاعت کا منصوبہ اب سے تقریباً تین برس قبل تیار کیا تھا۔ اس کلیات کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری ماہرِ پریم چند **جناب مدن گوپال** کو دی گئی۔ اس کلیات کی اب تک 20 جلدیں شائع ہو چکی ہیں، بقیہ دو جلدیں جلد ہی منظرِ عام پر آنے والی ہیں۔

کلیاتِ پریم چند (جلد-1)

اس جلد میں چار ناول شامل ہیں۔ "اسرارِ معابد" میں پریم چند نے مذہب کے نام پر استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ "ہم خرما و ہم ثواب" میں بیوہ کی شادی کی وکالت کی گئی ہے۔ "جلوۂ ایثار" میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا ہے اور "بیوہ" میں بیوہ عورتوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

صفحات: 520، قیمت: -/128 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-2)

یہ جلد پریم چند کے مشہور ناول "بازارِ حسن" پر مبنی ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا ہے اور سماج کے اس فریب چہرے کو بے نقاب کیا ہے جو عورت کو جسم فروشی پر مجبور بھی کرتا ہے اور اس سے نفرت بھی کرتا ہے۔

صفحات: 308، قیمت: -/76 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-3)

یہ جلد ناول "گوشۂ عافیت" پر مبنی ہے جس میں سرمایہ داروں کے ذریعے کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

صفحات: 524، قیمت: 108 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-4)

یہ جلد "چوگانِ ہستی" پر مشتمل ہے جس میں پریم چند نے ہندوستان میں انگریزوں کی مفاد پرستی، سیاسی رہنماؤں کی مصلحت پسندی اور ملک کی جدوجہدِ آزادی کو موضوع بنایا ہے۔

صفحات: 721، قیمت: -/227 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-5)

کلیاتِ پریم چند کی یہ جلد "پردۂ مجاز" پر مبنی ہے جس میں ہندوستانی معاشرے میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور ہندو مسلم منافرت کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ مسئلۂ تاج کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

صفحات: 326، قیمت: -/317 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-6)

اس جلد میں پریم چند کے دو ناول شامل کیے گئے ہیں۔ "نرملا" جس میں عورت کی مظلومی اور بے بسی، بیوہ کی بے چارگی، بے میل شادی کے نتائج اور سماج کے ڈھکوسلوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور "غبن" میں مادی رسوم و رواجات میں الجھے لوگوں کی زندگی کا محاکمہ اصلاحی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔

صفحات: 449، قیمت: -/157 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-7)

یہ جلد پریم چند کے مشہور ناول "میدانِ عمل" پر مبنی ہے جس میں نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر ناخوشگوار ازدواجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گاندھیائی فلسفے سے متاثر اس ناول میں پچھڑے اور متوسط طبقے کے افراد کی عکاسی کے ساتھ ساتھ عورت کو صحیح معنوں میں ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 375، قیمت: -/132 روپے

کلیاتِ پریم چند (جلد-8)

اس جلد میں پریم چند کے شاہکار "گئودان" کے ساتھ ساتھ ان کا آخری ناول "منگل سوتر" بھی شامل ہے جو نامکمل رہ گیا۔ "منگل سوتر" میں خودنوشت کے انداز میں پریم چند نے انکشافِ ذات کے ساتھ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کی داستان بیان کی ہے۔

صفحات: 515، قیمت: -/172 روپے

نوٹ :- طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066. Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel.: 26103381, 26103938